# تاریخِ قصائدِ اردو

از

سید جلال الدین احمد جعفری زینبی

اُردُو مرکز
گنپت روڈ۔ لاہور

# تاریخ قصائدِ اردو

مؤلفہ

الحاج مولوی حافظ سید جلال الدین احمد جعفری زینبی


سول ایجنٹس

اردو مرکز — گنپت روڈ لاہور

اردو اکیڈمی سندھ — بندر روڈ کراچی

(دائمی حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں)

طبع سوم ———————— سنہ ۱۹۵۱ء
تعداد ———————— ایک ہزار
قیمت غیر مجلد ———————— عہ ر

ناشر
ادارہ شرکت مصنفین۔ تالپور بلڈنگ۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱

# فہرست مضامین مقدمہ


| شمار | عنوان | صفحہ | شمار | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | قصیدے کی ابتدا | ۹ | ۱۵ | احوال میر انشاء اللہ خاں انشا | ۴۲ |
| ۲ | قصیدے کے لغوی معنی اور اس کے شاعرانہ القاب | ۱۰ | ۱۶ | احوال محمد مومن خاں مومن | ۴۴ |
| ۳ | قصیدے کی غرض اور اس کے نتائج | ۱۲ | ۱۷ | احوال شیخ محمد ابراہیم ذوق | ۴۸ |
| ۴ | قصیدے کا لفظی حسن و قبح | ۱۴ | ۱۸ | احوال شیخ امان علی سحر لکھنوی | ۵۴ |
| ۵ | قصیدے کے معنی محاسن و معائب | ۱۶ | ۱۹ | احوال مرزا اسد اللہ خاں غالب | ۵۵ |
| ۶ | طرز ادا اور اسلوب بیان | ۱۷ | ۲۰ | احوال سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی | ۵۷ |
| ۷ | قصیدے کے مضامین اور ان کی ترتیب | ۱۷ | ۲۱ | احوال سید غلام حسین قدر بلگرامی | ۵۹ |
| ۸ | قصائد اردو کی حالت | ۲۰ | ۲۲ | احوال منشی امیر احمد مینائی | ۶۲ |
| ۹ | قصائد اردو کے ادوار اور ان پر تبصرہ | ۲۱ | ۲۳ | احوال نواب مرزا خاں داغ دہلوی | ۶۴ |
| ۱۰ | انتخاب قصائد کی نوعیت اور ان کی تعداد | ۳۱ | ۲۴ | احوال مولوی محمد محسن کاکوروی | ۶۶ |
| ۱۱ | تمہید احوال قصیدہ گویاں | ۳۳ | ۲۵ | احوال منشی امیر اللہ تسلیم | ۶۹ |
| ۱۲ | احوال ولی دکنی | ۳۵ | ۲۶ | احوال خواجہ الطاف حسین حالی | ۷۱ |
| ۱۳ | احوال مرزا محمد رفیع سودا | ۳۷ | ۲۷ | احوال مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی | ۷۳ |
| ۱۴ | احوال میر محمد تقی میر | ۳۹ | ۲۸ | احوال سید علی احسن احسن مارہروی | ۷۵ |

# فہرست قصیدہ



| شمار | نام قصیدہ گو | مصرع اوّل قصیدہ | نام ممدوح | اشعار اصل | اشعار منتخب | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ولی اللہ ولی دکنی | بے زباں پرتو اوّل ازل | حمد و نعت و منقبت | ۱۲۳ | ۳۰ | ۷۷ |
| ۲ | میر تقی میرؔ | جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل | منقبت حضرت علیؓ | ۷۲ | ۳۳ | ۷۸ |
| ۳ | مرزا رفیع سوداؔ | اٹھ گیا بہمن دے کا چمنستاں سے عمل | " | ۱۵۱ | ۴۷ | ۸۳ |
| ۴ | سحر لکھنوی | اے صبا جا کے بنارس سے اڑا لا بادل | صفت بہار | ۲۹ | ۲۹ | ۸۵ |
| ۵ | منیر شکوہ آبادی | پر تو مہر جو ہو شمع شبستانِ ازل | منقبت حضرت علیؓ | ۱۹۲ | ۹۳ | ۸۸ |
| ۶ | سید غلام حسن بلگرامی | باغ پر آج گھٹا ٹوپ اٹھا ہے بادل | نظام آصف جاہ دکن | ۲۳۰ | ۹۲ | ۹۳ |
| ۷ | مولوی محمد محسن کاکوروی | سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل | نعت شریف | ۱۴۳ | ۴۳ | ۹۶ |
| ۸ | امیر مینائی | عالم خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل | نواب کلب علی خاں رامپور | ۱۶۱ | ۶۸ | ۱۰۱ |
| ۹ | سوداؔ | علم طبی ہے طبابت تو سن رکھ ہمدم | حکیم میر محمد کاظم | ۲۹ | ۲۵ | ۱۰۵ |
| ۱۰ | میر انشاء اللہ خاں انشاؔ | نظر آئی مجھے کل با طفرۂ طوغ و علم | نواب سعادت علیخاں لکھنؤ | ۹۲ | ۴۴ | ۱۰۷ |
| ۱۱ | ذوقؔ | افق دل پہ مرے عیش و طرب دونوں بہم | اکبر شاہ ثانی | ۱۹۱ | ۳۰ | ۱۰۹ |
| ۱۲ | امیر مینائی | تخت کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہ قلم | نواب کلب علیخاں والی رامپور | ۱۲۲ | ۳۲ | ۱۱۱ |
| ۱۳ | داغ دہلوی | کیا جواں سال جواں بخت ہوا ہے عالم | میر محبوب علیخاں نظام دکن | ۱۰۱ | ۳۲ | ۱۱۳ |
| ۱۴ | سوداؔ | سوائے خاک نہ کھینچو گے منت دستار | منقبت امام حسینؓ | ۹۵ | ۲۵ | ۱۱۵ |

| شمار | نام قصیدہ گو | مصرع اوّل قصیدہ | نام ممدوح | [illegible] | [illegible] | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱۵ | میر تقی میر | فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجکو شکار | منقبت امام حسین ؑ | ۵۱ | ۲۵ | ۱۱۷ |
| ۱۶ | شیخ محمد ابراہیم ذوق | قلم جو صفحہ کاغذ پہ ہوے نکتہ نگار | محمد اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی | ۵۴ | ۳۲ | ۱۱۸ |
| ۱۷ | منیر شکوہ آبادی | شب گزشتہ ہجوم بلاے تھا میں دوچار | نعت شریف | ۱۶۱ | ۴۸ | ۱۲۰ |
| ۱۸ | قدر بلگرامی | چمن کا بیاہ ہے کلیوں کا ہو گیا انبار | نواب امیر حسن خاں والی محمود آباد | ۵۴ | ۵۸ | ۱۲۳ |
| ۱۹ | سودا | ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی | نعت شریف | ۴۸ | ۲۷ | ۱۲۷ |
| ۲۰ | منیر شکوہ آبادی | ترشح احباب سے ظاہر ہوا ہے بغض پنہانی | " | ۱۹۸ | ۱۱۴ | ۱۲۹ |
| ۲۱ | قدر بلگرامی | مصیبت وہ پڑی ہم پر کلیجہ ہو گیا پانی | مرزا عباس بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ | ۱۵۱ | ۹۱ | ۱۳۳ |
| ۲۲ | سودا | سنگ کو اپنے لئے کرتا ہے پانی آسماں | منقبت حضرت علی رض | ۱۲۹ | ۲۴ | ۱۴۷ |
| ۲۳ | امیر مینائی | فصل گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں | نواب کلب علیخاں والی رامپور | ۱۱۶ | ۳۲ | ۱۴۸ |
| ۲۴ | شیخ امیر اللہ تسلیم | نغمہ سنجی کے نہ قابل ہے ہزار بے زباں | واجد علی شاہ بادشاہ اودھ | ۷۴ | ۴۱ | ۱۵۰ |
| ۲۵ | سودا | مرغ معنی کے اگر صید پہ ہو خیال | نواب شجاع الدولہ لکھنؤ | ۵۷ | ۲۵ | ۱۵۳ |
| ۲۶ | ذوق | جنذا ساقی فرخ رُخ و خورشید جمال | ابو ظفر بہادر شاہ | ۵۸ | ۲۵ | ۱۵۵ |
| ۲۷ | سحر لکھنوی | گردشِ چرخ سے ابتر ہے زمانہ کا حال | مضحکات | ۲۶ | ۲۶ | ۱۵۶ |
| ۲۸ | میر انشاء اللہ خاں انشاؔ | نگھیاں نور کی تیار کرائے بوئے سمن | جارج سوم بادشاہ انگلستان | ۹۵ | ۴۹ | ۱۵۸ |
| ۲۹ | سحر لکھنوی | تو ملیں لا کے برانڈی کی سایئس سارن | مع بہار عیش باغ لکھنؤ | ۳۴ | ۳۰ | ۱۶۱ |
| ۳۰ | داغ دہلوی | میں ہوا بادہ پیما طرف ملک دکن | میر محبوب علی خاں نظام دکن | ۹۹ | ۹۹ | ۱۶۳ |

| شمار | نام قصیدہ گو | مصرع اول قصیدہ | نام ممدوح | [illegible] | [illegible] | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۳۱ | ذوق | مہر آرائے گردوں جب تک سلطان خاور رہو | ابوظفر بہادر شاہ | ۹ بند | ۹ بند | ۱۶۸ |
| ۳۲ | محسن کاکوروی | عزیز مصر جب تک مشتری ہو مہر قیصر ہو | واجد علی شاہ بادشاہ | ۱۲ بند | ۱۲ بند | ۱۷۱ |
| ۳۳ | احسن مارہری | عروس باغ جب تک تاج نوشا رگل تر ہو | جارج پنجم قیصر ہند | ۱۳ بند | ۱۳ بند | ۱۷۵ |
| ۳۴ | سودا | بسان دانۂ نو روئیدہ یک بارہ گرہ | منقبت حضرت علیؑ | ۴۱ | ۲۴ | ۱۷۸ |
| ۳۵ | منیر شکوہ آبادی | پڑی ہے مجھ سے عناصر دل میں یار گرہ | نواب کلب علی خاں والی رامپور | ۱۱۰ | ۳۲ | ۱۸۰ |
| ۳۶ | سودا | جوں غنچہ آسماں سے مجھے بہر عرض حال | منقبت امام خراساں | ۴۶ | ۲۵ | ۱۸۰ |
| ۳۷ | میر تقی میر | ایک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال | منقبت حضرت علیؓ | ۵۴ | ۲۵ | ۱۸۰ |
| ۳۸ | سودا | لکھے ہے کاتب ورائے منشی تقدیر | آصف جاہ نظام الملک | ۵۲ | ۲۵ | ۱۸۲ |
| ۳۹ | ذوق | نہ ہے نشا اگر کیجئے اسے تحریر | ابوظفر بہادر شاہ | ۱۰۰ | ۲۹ | ۱۸۳ |
| ۴۰ | سودا | سودا پہ جب جنوں کیا خواب خور حرام | نواب آصف الدولہ لکھنؤ | ۴۴ | ۲۵ | ۱۸۸ |
| ۴۱ | میر تقی میر | غنچے کے دل پہ آتے ہیں اندوہ اب تمام | منقبت حضرت علیؓ | ۴۳ | ۲۵ | ۱۹۰ |
| ۴۲ | سودا | ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب | شاہ عالم بادشاہ | ۲۹ | ۲۵ | ۱۹۳ |
| ۴۳ | ذوق | پیری میں یاں بزمزدہ ہے جام شراب ناب | ابوظفر بہادر شاہ | ۵۶ | ۳۱ | ۱۹۳ |
| ۴۴ | سودا | کیا قلم کو رقم سے ہے منظور | نواب آصف الدولہ لکھنؤ | ۳۸ | ۳۶ | ۱۹۶ |
| ۴۵ | خواجہ الطاف حسین حالی | میں بھی ہوں حسن طبع پہ مغرور | نعت شریف | ۷۵ | ۷۵ | ۱۹۹ |
| ۴۶ | سودا | اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا | منقبت امام موسیٰ رضاؓ | ۲۶ | ۲۶ | ۱۰۴ |

| شمار | نام قصیدہ گو | مصرع اول قصیدہ | نام ممدوح | [illegible] | [illegible] | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۴۷ | سحر لکھنوی | تمام ہند کی تھا جان لکھنؤ اپنا | شہر آشوب مدح شاہ دزیر اودھ | ۱۳۶ | ۶۰ | ۱۹۶ |
| ۴۸ | انشا | صبح دم سینے جو لی بستر گل پر کروٹ | شاہزادہ سلیمان شکوہ | ۱۰۵ | ۲۴ | ۲۰۹ |
| ۴۹ | امیر مینائی | تا کجا کوتھی اے دست ہوس کر جھوٹ | نواب کلب علیخاں والی رامپور | ۱۳۲ | ۹۱ | ۲۱۱ |
| ۵۰ | انشا | اے خداوند مہر و مہ و ثریا و شفق | حمد | ۴۴ | ۲۴ | ۲۱۵ |
| ۵۱ | ذوق | ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارشق | ابو ظفر بہادر شاہ | ۵۱ | ۲۹ | ۲۱۶ |
| ۵۲ | سحر لکھنوی | رندو بہار آگئی تباہ ہوئی خزاں | وزیر اودھ | ۷۵ | ۳۴ | ۲۱۸ |
| ۵۳ | منیر شکوہ آبادی | ہوتا ہے ماہ عید افلاک پر عیاں | نواب کلب علیخاں والی رامپور | ۵۰ | ۳۲ | ۲۲۰ |
| ۵۴ | ذوق | واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا | ابو ظفر بہادر شاہ | ۵۵ | ۵۵ | ۲۲۲ |
| ۵۵ | تسلیم لکھنوی | نغز میں تقدیر دیتی ہے لباس اغنیا | نعت شریف | ۳۴ | ۳۴ | ۲۲۶ |
| ۵۶ | ذوق | ہیں مری آنکھ میں نکو کیے تماشہ گوہر | ابو ظفر بہادر شاہ | ۶۲ | ۲۱ | ۲۲۸ |
| ۵۷ | منیر شکوہ آبادی | قلزم فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر | نواب تجمل حسین خاں فرخ آباد | ۳۹ | ۲۲ | ۲۳۰ |
| ۵۸ | مومن خاں مومن | کوئی اس دور میں جئے کیوں کر | منقبت حضرت ابوبکر صدیق رض | ۱۲۶ | ۴۳ | ۲۳۱ |
| ۵۹ | اسمٰعیل میرٹھی | قید سخت درخانۂ بے در | رئیس نا معلوم الاسم | ۵۵ | ۳۶ | ۲۳۴ |
| ۶۰ | مومن | جس میں نغمۂ تسبیح یوں طرب مانوس | نعت شریف | ۹۷ | ۶۰ | ۲۳۶ |
| ۶۱ | مرزا غالب | دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں | منقبت حضرت علی رض | ۴۳ | ۴۳ | ۲۴۰ |
| ۶۲ | " | ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام | ابو ظفر بہادر شاہ | ۵۸ | ۳۰ | ۲۴۲ |

| شمار | نام قصیدہ گو | مصرع اوّل قصیدہ | نام ممدوح | [illegible] | [illegible] | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۶۳ | خواجہ الطاف حسین حالی | زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے شادمانی کا | میر محبوب علیخاں نظام دکن | ۴۷ | ۳۲ | ۱۴۴ |
| ۶۴ | قدر بلگرامی | آئی بہار سبز ہوا چرخ اخضری | راجہ مان سنگھ | مخمس ۴ بند | ۱۰ بند | ۱۴۶ |


# تاریخ مثنویات اُردو

مرتبہ جناب مولوی جلال الدین احمد جعفری زینبی

جسمیں پہلے بطور مقدمہ مثنوی کی جامعیت۔ اور اسکی معنوی حیثیت اور عربی فارسی میں اُن کا وجود۔ اور مثنوی کے اقسام اور اُس کی وسعت۔ اور معیار مثنوی۔ اور حسن ترتیب اور کیرکٹر اور کیرکٹر اتحاد۔ واقعہ نگاری کا کمال اور اُس کے نقائص۔ مثنوی کے خصوصی مضامین جنوبی ہند کی مثنویاں۔ قطب شاہ اور عادل شاہ عہد کی مثنویاں۔ شمالی ہند کی مثنویاں۔ اساتذہ لکھنؤ کی مثنویاں۔ دورہ آخر کی مثنویاں۔ مثنوی کے اوزان۔ تعداد اشعار ترتیب مضامین وغیرہ بیان کرکے ۱۶ شعرا کے حالات اور اُن کی مثنویوں کے نمونے اور اُن کے خصوصیات بتلائے گئے ہیں۔

یہ مثنویوں کی ایسی مفید تاریخ اور دلچسپ انتخاب ہے کہ اب تک مثنوی کے متعلق ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ قیمت فی جلد مجلد تین روپے (سے)

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ شرکت مصنفین۔ تالپور بلڈنگ۔ بندر روڈ۔ کراچی

۴۸۷

مقدمہ

# قصیدۂ اُردو

اور

## اُس کی ارتقائی تاریخ

قصیدے کی ابتدا | اُردو زبان لفظی و معنوی ہر حیثیت سے فارسی کی تقلید کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے یہاں تک کہ ترتیب کلام میں بھی وہی پابندیاں نظر آتی ہیں جن کو ابتدائے فارسی نے اپنے لئے پسند کیا تھا، البتہ قصیدہ گوئی کا آغاز فارسی کی طرح اُردو میں نہیں ہوا۔ جس طرح اُردو فارسی کی ذلہ رُبا ہے اسی طرح ایرانی شاعری عربی سخن گُستری کی خوشہ چینی کر چکی ہے۔ اہل عرب کی سخن آرائیاں ابتداءً فخریہ رجز یا قصائد سے شروع ہوئی ہیں۔ عجمیوں نے بھی خلفائے بنو عباس کے دربار میں قصیدے سے شاعری کی بسم اللہ کی ہے۔ ان دونوں کی ابتدا میں فرق اتنا تھا کہ عربی شاعر کسی خاص جوش قومی و ملکی سے مرعوب و متاثر ہو کر قصیدہ کہتے تھے اور عجمی ذاتی اغراض سے مغلوب ہو کر نغمہ سرا ہوتے تھے۔ دونوں کی مثالیں علی الترتیب امرؤ القیس اور عویر کی سچی مداحی اور عباس مروزی اور مامون رشید کی مصنوعی تعریف میں اہل نظر دیکھ سکتے ہیں۔

اُردو کی غزل گوئی کے آغاز میں وسیع یا محدود، محکم یا متزلزل سلاطین مغلیہ اور دیگر ارباب دول کے دربار موجود تھے نیز اہل حاجت مداحی و خوشامد کے عادی ہو چکے تھے اس لئے یہ امر بعید نہ تھا کہ غزل سے پہلے قصیدہ گوئی شروع ہو جاتی لیکن ایسا نہ ہونے کا تنہا ایک سبب معلوم ہوتا ہے کہ قصیدے کا اسلوب بیان اور انداز اداچاہتا ہے کہ اس کے الفاظ شاندار ہوں، معنی عالی ہوں، بندشیں مضبوط اور سنجیدہ ہوں، جس کے لئے کم از کم اُس وقت کی اُردو متحمل نہیں ہو سکتی تھی، اور پھر یہ کہ عموماً ممدوح و مداح از سرتاپا عجمیت کے تکلفات میں جکڑے ہوئے تھے۔ دشوار کیا محال تھا کہ زبان کی ابتدائی ہلکی پھلکی بندشیں اور بے ربط اسالیب پسند خاطر ہو سکتے اور جب سند قبول ہی نہ مل سکتی تو فضول گوئی سے حاصل ہی کیا ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ قصیدہ گوئی کا آغاز قدما میں ہو چکا تھا، اور وہ متقدمین جنوبی ہند کے متمکن تھے، ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو لیکن عادل شاہی اور قطب شاہی وغیرہ عہدوں کی تصنیفیں کم دستیاب ہوگئی ہیں کوئی سبب معقول قصائد کی عدم دستیابی کا معلوم نہیں ہوتا، اس صورت میں اگر اردو قصیدہ گوئی کو نصرتی و وجہی وغیرہ شعرائے دکن کے عہد سے وابستہ کرنا تفضیع اوقات کا مرادف ہے۔ اُردو شاعری جس ترتیب سے آج ہمارے سامنے موجود ہے اُس کا ناظم اول ولی دکنی کے سوا دوسرا نظر نہیں آتا، اس تاریخی تحقیق کا مطابقت

سے قصیدہ نویسی کا تعین بھی اُسی کے زمانے میں ہوتا ہے۔

قصیدے کے لغوی معنی اور اُس کے شاعرانہ القاب! | اہل لغت نے قصیدے کے لغوی معنی مغز سطبر (آکل دار) گودا، کے لکھے ہیں، اور اصطلاح شاعری میں اُس نظم کو قصیدہ کہتے ہیں جس میں مدح یا ذم یا وعظ و نصیحت یا حکایات و شکایات وغیرہ منظوم و موزوں ہو۔ وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چوں کہ اُس میں اپنے مضامین عالی وکثیر مندرج کئے جاتے ہیں جو طبعی مذاق کے لئے لذت بخش ہوتے ہیں اس واسطے اس کو قصیدہ کہتے ہیں یا یہ کہ وہ باعتبار معنی و مضمون دوسری اصناف سخن میں ممتاز ہے۔ جس طرح کہ تمام اعضا میں سر اور مغز سر مو قر و نمایاں ہے۔ اِس مناسبت سے اُس کو مغز سخن سمجھ کر قصیدہ کہا گیا۔ از روئے صرف قصیدہ واحد ہے اور اُس کی جمع قصائد ہے۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ فارسی میں اُس کو چامہ بھی کہتے ہیں اور اہل عرب کے محاورے میں قصائد کو آخری حرف کی نسبت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً ردیف یا قافیہ کا آخری حرف اگر لام ہے تو اُس کو لامیہ، اور اگر میم ہے تو اُس کو میمیہ اور جیم ہے تو جیمیہ سے تعبیر کریں گے۔ مضامین کے اعتبار سے بھی قصائد کے مختلف القاب ہیں۔ یعنی تشبیب میں اگر بہار و گلزار و سبزۂ و گل وغیرہ کا ذکر ہے تو بہاریہ، اور شرح حال یا شکایت گردش افلاک ہے تو حالیہ، اور اوصاف حسن و عشق ہیں تو عشقیہ، اور اپنے فخر و کمال کا بیان ہے تو فخریہ کہیں گے۔

**قصیدے کی غرض اور اُس کے نتائج**

اُردو ادب چوں کہ سراسر فارسی کی سربراہی میں رواج پذیر ہوا ہے اور فارسی نے عربی کے اثرات قبول کرلئے ہیں۔ اسلئے ہر صنف سخن کی تعریف و توضیح میں جب تک عربی و فارسی کی مثالیں نہ لکھی جائیں گی کوئی مفہوم سمجھ میں نہ آسکے گا۔ اس تمثیلی مجبوری کی اصل وجہ یہی ہے کہ اُردو کی ابتدائی حالت بہت ہی نامربوط رہی ہے اور اُس نے مُدت مدید تک بلکہ اب تک کوئی علمی حیثیت قائم نہیں کی ہے جس میں ایسے مضامین عالی اور خیالات بلند پیدا ہوسکیں۔ مختلف شاعرانہ مضامین کے لئے قصیدہ سب سے بڑا میدان ہے، ہر قسم کے مضامین صرف قصیدے کے ذریعے سے ادا کئے جاسکتے ہیں، مثلاً کوئی دوست جُدا ہوا، کوئی موثر منظر نظر سے گزرا۔ کسی نے کوئی ناموری کا کام کیا، کسی نے اپنی غفلت کی وجہ سے اپنے فرائض کو ترک کردیا، غرض کہ اسی قسم کے تمام مضامین قصیدے میں عمدگی سے ادا ہوسکتے ہیں اور فی الحقیقۃ اسی غرض و غایت کے لئے اس صنف کا ایجاد ہوا ہے، عرب کے قصائد اسی مضامین سے مملو ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے قصائد جذبات سے لبریز ہیں اور اُنسے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں اور اُن کے نہایت موثر و مفید نتائج دیکھے گئے ہیں۔ عرب اولاً تو کسی کی شاعرانہ مدح کرنی عار سمجھتے تھے اور مدح کرتے بھی تھے تو کبھی صلہ اور انعام لینا گوارا نہ کرتے تھے، ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے

کہاکہ میری مدح لکھو اُس نے کہا "اِفْعَلْ حَتّٰی اَقُوْلُ" یعنی تم کچھ کر کے دکھاؤ تو میں کہوں۔ عرب کا مشہور شاعر میموں بن قیس جس کو نابینا ہونے کے سبب اعشیٰ کہتے تھے۔ اُس کے کلام میں یہ تاثیر ضرب المثل تھی کہ جس کی مدح کرتا وہ عزیز و نیک نام اور جس کی ہجو کرتا وہ ذلیل و رسوا ہو جاتا، ایک بار ایک عورت اُس کے پاس آئی اور یہ کہا کہ میری لڑکیاں بہت ہیں اور کہیں انکو بر نہیں ملتا اگر چاہے تو لوگوں کو شعر کے ذریعے سے ہمارے خاندان کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اعشیٰ نے اُس کی لڑکیوں کے حسن و جمال اور خصائل پسندیدہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا جس کی بدولت اُن لڑکیوں کی صورت اور سیرت کا چرچا تمام ملک میں پھیل گیا اور چاروں طرف سے اُن کے پیغام آنے لگے یہاں تک کہ اُمرا نے بھاری بھاری مہر مقرر کر کے اُن سے شادیاں کریں۔

عرب کے قصے سُن چکے۔ عجمیوں کی قصیدہ سرائی کے اثرات دیکھو، امیر نصیر ۹۲۵ھ میں بخارا کو چھوڑ کر مع ارکان دولت ہرات میں قیام پذیر تھا اور اس شہر سے اُسے ایسی دل بستگی پیدا ہو گئی کہ وہ بخارا کو بھول بیٹھا، امرا و وزرا بہت کوشاں تھے کہ وہ کسی طرح وطن کو مراجعت کرے مگر وہ کسی کی نہ سُنتا تھا بالآخر اُمرائے دربار نے رودکی سے کہا اور اُس نے ایک قصیدہ امیر کے سامنے پڑھا۔ جس کو سُن کر یہ اثر ہوا کہ امیر فوراً دربار سے اٹھا اور بغیر کسی ساز و سامان کے بخارا کو روانہ ہو گیا۔ اُس قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:۔

باد وجوے مولیاں آید ہمی　　بوے یار مہرباں آید ہمی
ریگ آموے با درشتیہائے او　　زیر پایم پرنیاں آید ہمی
آب جیجوں وشگرفیہائے او　　خنک مارا تامیاں آید ہمی
اے بخارا شاد باش و دیرزی　　میر زوت شاد ماں آید ہمی
میر سرو است و بخارا بوستاں　　سرو سوے بوستاں آید ہمی
میر ماہ است و بخارا آسماں　　ماہ سوے آسماں آید ہمی

افسوس ہے کہ اُردو میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس نے اپنا کوئی تاریخی یادقتی اثر چھوڑا ہو۔ بجز اسکے کہ کوئی شعر یا مصرع مشہور ہو کر ضرب المثل بن گیا ہو اور چونکہ یہ خصوصیت شہرت صرف قصیدے ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ غزل، رباعی، قطعہ سب میں یہ بات پائی جاتی ہے اس واسطے مثال کی تلاش فضول سمجھی گئی۔

**قصیدے کے لفظی حسن و قبح** | زبان بڑا اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف حیثیتیں رکھتی ہیں اور یہ تنوع صرف اسی لئے رونما ہوتا ہے کہ کَلِّمِ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ کے اصول پر متکلم کو مخاطب کا لحاظ کرنا لازمی ہے ورنہ بقول شخصے وہ کلام ع نہ میں سمجھوں زباں اُن کی نہ وہ سمجھیں زباں میری" کا مصداق ہو جائے گا۔ قصیدہ چونکہ عموماً سلاطین و اُمرا کے دربار سے وابستہ ہے جہاں علوم و فنون کے ماہر جمع رہتے ہیں، نیز اس میں عالی اور بلند مضامین منظوم کئے جاتے ہیں، اس لئے قصیدے

کے متعلق بالعموم اربابِ فن نے مان لیا ہو کہ اُس کے الفاظ متین، باوقار اور شاندار ہونے چاہئیں۔ عدل، شجاعت، عفت اور سخاوت وغیرہ یہ سب اوصاف بجائے خود اپنی مرتبت وعظمت میں بلند پایہ رکھتے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ اُن کے لئے الفاظ بھی ایسے تلاش کئے جائیں جو معمولی روزمرہ سے الگ ہوں۔ اس جدت طرازی میں ایک خصوصی وصف یہ ہے کہ سامع پر اُن کا رعب پڑتا ہو اور اسی مرعوب ہونے کو یا الفاظ دیگر اثرانداز کہنا چاہئے۔ مثلاً مرزا غالب کے اشعار ذیل جزالت الفاظ کا بہترین نمونہ ہیں:۔

ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام — کون ہے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا
نام شاہنشہ بلند مقام — تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
مظہر ذوالجلال و الاکرام — قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
نو بہار حدیقۂ اسلام — شہسوار طریقۂ انصاف
جس کا ہر قول معنی الہام — جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
رزم میں اُستاد رستم و سام — بزم میں میزبان قیصر و جم

لیکن جزالت الفاظ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قصیدوں کو بوجھل الفاظ، مبہم لغات اور غیر معروف اصطلاحات علمی سے گراں بار کر دیا جائے۔ جیسے ذوق مومن اور منیر کے بعض قصائد کے اشعار ہیں۔ ان کے برخلاف اُن لفظوں سے پرہیز کرنا چاہئے جو سُبک ہوں بازاری ہوں اور جہلا کی بول چال

میں سُنے جاتے ہیں۔

**تنقید کے معنوی محاسن و معائب!** الفاظ کی ترکیب، ترتیب اور اُن کے حُسن بیان سے جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں اُن کا نام معانی ہیں اگر الفاظ لباس ہیں تو معنی اُس کا مجسمہ یا پیکر ہیں۔ الفاظ صورت ہیں تو معنی اُس کی سیرت ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کندۂ ناتراش یا کسی کاواک چیز کو زیور و لباس کی آراستگی عمدہ بنا سکتی ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ پیکر و جسم کی خوبی اور حُسن کو ظاہری آرائش سے دو بالا کیا جائے یہ نہ ہو کہ وہ لباس محض لفافہ ہی لفافہ ہو، اور جب اُس کے ذریعے سے حقیقت پنہاں پر نظر ڈالی جائے تو دیکھنے والے کو تنفر ہونے لگے۔ اسی حقیقت کے حسن کو حسن معنی کہتے ہیں اور الفاظ اسی عالم معانی کی تصاویر یا تصاویر کے اجزا ہوتے ہیں یوں تو ہر شخص اپنے کلام میں الفاظ سے معانی کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس صنعت کا اُستاد کامل شاعر ہے جس کا دقیقہ سنج احساس اور نکتہ رس شعور حقیقت کے وہ خط و خال دکھاتا، بلکہ وہ چھپے ہوئے راز اُس کے سامنے لاتا ہے جن کو غیر شاعر چاہتا ہے اور نہیں دیکھ سکتا، تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، شاعر انھیں کو بیان کے موزوں ترین قالب میں ڈھالتا اور وہ صناعیاں دکھاتا ہے کہ دیکھنے والے دیکھتے اور حیران رہ جاتے ہیں، اسی لئے شاعری کو معنوی مصوری کہتے ہیں اور شاعر کی تصویر جمال معنی اور حُسن

صنعت کا مرقع ہوتی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ الفاظ کے حسن کا اظہار جذبات کی تاثیر محاکات کی تصویر اور تخئیل اور فکر کی خوبیوں سے وابستہ ہونا چاہئے۔ اگر شستہ اور برجستہ الفاظ میں ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں گے۔ جن میں ابتذال رکاکت اور سوقیانہ انداز ہوگا تو وہ اشعار معنوی لطف سے معرّا ہوں گے۔ جیسے سوداؔ اور انشاؔ کے قصائد میں اکثر اشعار ملتے ہیں۔

**طرزِ اور اسلوب بیان** لفظی و معنوی خصوصیات کے بعد شاعری میں طریقۂ تکلم اور سلیقۂ بیان کا لحاظ اشد ضروری ہے۔ شاعرانہ صنائع و بدائع میں مبالغہ ایہام اور مراعاتِ النظیر وغیرہ تمام صنعتیں درحقیقت حُسنِ کلام کے لئے ایجاد ہوئی ہیں" اور ادبی حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ ہر زمانے کا مذاق ان سب خصوصیت کو ایشیائی شاعری سے جدا نہیں کرسکتا۔ ہاں کمی و بیشی ضرور ہوجائے گی اور ہونی چاہئے۔ بایں ہمہ ان باتوں کو اس انداز سے کہنا چاہئے جس سے سننے والا محظوظ ہو اور طبیعت کو تکدر نہ ہو۔ خواہ مخواہ رعایت لفظی کے پھیر میں ایسی ترکیبیں (مثلاً تعقیدات اجنبی محاورات وغیرہ) شامل کردینا۔ جن سے سیدھے سادے معنی کے سمجھنے میں دقتیں لاحق ہوں، شاعر کے عجز اور عدم قدرت کو نمایاں کرتا ہے۔

**قصیدے کے مضامین اور اُن کی ترتیب:** عرب اور ایران کی شاعری میں قصیدے کا آغاز و انجام تین چیزوں پر منحصر ہے۔ جن کا اصطلاحی نام **مطلع**

**تخلص** اور **مقطع** ہے **مطلع** سے مراد وہ ابتدائی اشعار ہیں جو تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔ اس تمہید کو تشبیب کا لقب دیا گیا۔ اگرچہ عرب میں اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اہل عرب مدحیہ قصائد میں پہلے عشقیہ لکھا کرتے تھے اور چونکہ مادی عشق شباب کا جزو لاینفک ہے اس لئے اس تمہید کو تشبیب (شباب کا تذکرہ) کہا گیا۔ لیکن عرب کے بعد ایران اور ایران کے بعد ہندوستان میں فارسی و اردو کے لئے یہ نوعیت مضمون مخصوص نہیں رہی بلکہ ہر تمہید کو جس میں خواہ حسن وعشق کا مذکور ہو یا بہار و خواب کا تذکرہ ہو۔ سب کو تشبیب ہی کہنے لگے۔ اس مضمون کے بعد تخلص کا نمبر آتا ہے جس کو مخلص بھی کہتے ہیں اور فارسی میں گریز بھی۔ جس کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ تمہید لکھتے لکھتے اس طرح ممدوح کا ذکر چھیڑ دیا جائے کہ وہ مضمون بھی پہلے مضمون کا جزو معلوم ہو گویا بلاقصد بات میں بات پیدا ہو گئی۔ مثلاً مرزا رفیع سودا کے ایک قصیدہ نعتیہ کی تشبیب اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی ۔۔۔ نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

ان تمہیدی اشعار میں دو متضاد چیزوں یا حالتوں کو دکھایا ہے اور اسی ضمن میں ایک غزل لکھی ہے۔ غزل کے بعد جس طرح گریز کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی مضمون سے دوسرا مضمون پوری مناسبت کے ساتھ پیدا

ہو گیا ہے۔ مثلاً ؎

سمجھ لے نا قباحت فہم کب تک یہ بیاں ہوگا ادائے چین پیشانی و لطف زلف طولانی

خدا کے واسطے باز آتو اب خوباں کے ملنے سے نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل اُن کے چشم و زلف پر ہر بار ہوئے صعب یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیف مسلمانی

اس آخری شعر کے مضمون اور لفظ مسلمانی سے کام لیکر یہ شعر کہا جاتا ہے:۔

نہ ہے دین محمدؐ پیروی میں اسکی جو ہوئے رہے خاک قدم سے اس کی چشم عرش نورانی

گریز کے سلسلے میں وہ سب مدارج طے کئے جاتے ہیں جن میں ممدوح کی ذات و صفات اور تمام خصوصیات کی تعریف کی جاتی ہے۔ جس میں وقتاً فوقتاً حسب موقع کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یعنی بادشاہ وزیر اور امراء کی تعریف ہوتی ہے تو ذاتیات کے بعد اُن کی صفات میں سخاوت، شجاعت، انصاف و عدل وغیرہ پھر اُن کی فوج کا وصف۔ اسی کے ساتھ تلوار۔ گھوڑا۔ ہاتھی۔ غرض تمام متعلقات کا بیان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عرفا و صلحا، حکما و علماء اور دوسرے ممدوحین کی حیثیت و شخصیت کے مطابق ان کے اوصاف موزوں کئے جاتے ہیں۔

تشبیب و تخلص (گریز) کے بعد تیسری چیز مقطع ہے جس پر قصیدہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اس عنوان کے تحت میں پہلے اپنے مطالب و اعتراض یا

اپنی اچھی بری حالت دکھائی جاتی ہے اور آخر میں ممدوح کے حق میں دعائیں دے کر قصیدہ ختم کیا جاتا ہے۔ ان تینوں ترتیبوں میں متقدمین و متاخرین شعرا حسب مذاق مناسب اضافہ و ترمیم کے ساتھ کمی و بیشی کرتے رہتے ہیں۔ یعنی کسی نے تشبیب و تمہید کا التزام کیا کسی نے بغیر کسی تمہید کے ابتدا ہی سے اصل مدعا یا تعریف شروع کر دی۔

**قصائد اردو کی حالت** یہاں تک جس قدر لکھا گیا وہ عربی فارسی اور اُردو کے لئے قدر مشترک کا حکم رکھتا ہے۔ اب یہ دکھانا منظور ہے کہ ان تمام خصوصیات میں اُردو زبان نے کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کی مختصر تصریح یہ ہے کہ جب سے قصائد نویسی کی اغراض محض انعام و اکرام سے وابستہ ہوگئیں۔ اس وقت سے بالاکثر وہ محاسن اخلاقی مفقود ہوگئے۔ جو قومی اور ملکی اصلاح کے لئے ضروری تھے لہٰذا اب قصیدہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ممدوح سے مداح کو منفعت مالی حاصل ہو۔ اس منفعت دنیا کے لئے دربار سلاطین اور اہلِ دول کی سرکاروں کے سوا اور کسی سے یہ امید کی جاسکتی تھی۔ ہندوستان میں جب تک جایزہ و صلہ شعرا کو ملتا تھا وہ زمانہ ولادتِ اُردو کے وقت اگر بالکل مفقود نہیں ہوا تو اس قدر محدود ہو گیا تھا کہ دادا نے اگر ابوطالب کلیم کو روپوں میں تلوا کر اور ۵۰۰ روپے صلہ میں دے کر ملک الشعرا بنالیا تو پوتے نے صرف پچاس ساٹھ روپے ماہوار مقرر کر کے ذوق کو خاقانی ہند کا لقب بخشا۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا ۔

اسی واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو شاعری صنفِ قصیدہ میں کس قدر ترقی کر سکتی تھی ۔ ایرانی سخن آرائی میں بالاکثر ہر شاعر کے سرمایۂ کلام میں قصائد کا ذخیرہ اس قدر ہے کہ وہ دیگر اصنافِ سخن سے المضاعف نہیں تو قریب قریب غزلوں کے برابر ضرور ہے ۔ بلکہ بعض شعرائے فارس تو اپنے خرمنِ سخن میں صرف قصائد ہی رکھتے ہیں ۔ برخلاف اس کے اُردو میں کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس نے چند اسے گنے قصیدوں سے زیادہ اس صنف میں کہا ہو اُردو کے مشہور ترین قصیدہ گو مرزا رفیع سوداؔ ہیں اُن کے سرمائے میں بھی قصیدوں کا نمبر دیوانِ غزل سے کم ہے ۔ بہر حال شعرائے اُردو نے جو کچھ کہا ہے وہ یکسر فارسی اندازِ بیان کی نقالی ہے ۔ تمام خصوصیات متذکرہ بالا میں کوئی تنوّع ، کسی قسم کی جدّت نہیں ، اب رہی زبان اُس کی جو ابتدائی ہونی چاہئے ۔ وہی نمونے پُرانے زمانے کے قصیدوں میں ملتے ہیں جس کی تفصیل و تشریح ادوارِ قصائد میں کی جاتی ہے ۔

**قصائدِ اُردو کے دور اور اُن پر تبصرہ**

اس تبصرے میں عموماً عام شاعری اور خصوصاً قصیدہ گوئی کے متعلق کسی قسم کی مذہبی یا اخلاقی بحث منظور نہیں ہے کیونکہ یہ اُنتخاب صرف اقسامِ شاعری کی تعریف و حقیقت پیش کر رہا ہے ۔ کوئی محاکمہ یا مناظرہ ۔ دکھانا یہ ہے کہ اُردو میں جن شعراء نے قصیدے کہے ہیں اُنھوں نے

صناعت شعری کے ماتحت کتنی کامیابی پاناکامیابی حاصل کی ہے ۔ مبالغہ آمیز استعارات ۔ بعید الفہم تشبیہات ۔ اور اسی طرح کے دوسرے تکلفات کی تنقید سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا ہے ۔ قصیدہ خواہ نعت میں کہا گیا ہو یا منقبت میں مدح امرا و سلاطین کے لئے لکھا گیا ہو یا ہجو و ہزل کے واسطے یہاں صرف اُن خصوصیات شاعرانہ سے غرض ہے ۔ جو محض زبان و بیان کے اندازہ و انداز سے متعلق ہیں ۔ اور تاریخی حیثیت سے اس صنف میں جس قدر عہد بہ عہد ترقیاں اور تبدیلیاں نمایاں ہوئی ہیں اُن کو مثالوں کے ساتھ طالب علموں کے لئے یکجا کر دیا ہے ۔

شاعری کے وہ اوّلین نمونے جن کا تعلق زمانی اب سے ۴ - ۵ صدی قبل ہے ۔ صرف جنوبی ہند و دکن ، میں ملتے ہیں ، اُس عہد کے شعرا میں ہاشمی ، نصرتی وجہی وغیرہ اور بعض سلاطین قطب شاہی کا پتا چلتا ہے کہ اُن لوگوں نے سخن گستری کے میدانوں میں اپنی اپنی جولانیاں دکھائی ہیں ، لیکن اُن سب کے ذخائر کلام میں مثنوی ، مفردات ، قطعات اور مراثی کے سوا قصائد کا وجود اس وقت تک متحقق نہیں ہے اور اگر کسی کو اس کا نشان ملا ہوگا تو اس کا منہ دیکھی نظر نہیں ہے اس لئے اُس وجود کو کالعدم سمجھنا چاہئے ۔ صوبجات دکن کے بعد ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اُردو سخن سرائی کا سُراغ اورنگ زیب عالمگیر سے پہلے نہیں ملتا ۔ اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ موجودہ روش اور انداز ترتیب کا موجد

وَلیؔ دکنی (اورنگ آبادی) سے پہلے کوئی نظر نہیں آتا۔ شاہجہاں آباد (دہلی) میں انھیں وَلیؔ کے دیوان کی آمد نے اس طرزِ سخن کو پھیلایا۔ جس کی ترقی یافتہ صورت آج ہر اُردو شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے۔ ان حالات و واقعات کو مدنظر رکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اُردو قصیدہ گوئی کا رواج بھی وَلیؔ دکنی کی کرامات میں شامل ہے۔ لیکن قصائد کی واقعی ترقی قدما کے دوسرے دَور میں مرزا رفیع سَوداؔ کی بلندیٔ فکر اور بیان کی خوش اسلوبی کے طفیل میں ہوئی۔ سَوداؔ کے بعد اِنشاؔ۔ اِنشاؔ کے بعد ذوقؔ شہرت بخصوصیت اس صنف میں مانی جاتی ہے۔ ادوار کے لحاظ سے قصیدہ گو شعرا کے تین دَور قائم ہوسکتے ہیں۔

یعنی پہلا دَور وَلیؔ دکنی سے حاتمؔ و آبروؔ تک۔ دوسرا دَور سَوداؔ سے انشاؔ و مصحفیؔ تک۔ تیسرا دَور ذوقؔ اور اُن کے معاصرین تک۔ چوتھا دَور سحرؔ، منیرؔ، امیرؔ اور داغؔ وغیرہ تک۔ لیکن طرز ادا اور اسلوب بیان، نیز اصلاح خیالات پر نظر کرتے ہوئے پانچواں دَور اور قائم کرنا چاہیے جس میں پُرانے انداز کے تقلیدی مضامین اور ترتیب سے قطع نظر کی گئی ہے اور داخلی فلسفی۔ یا بالفاظ دیگر فطری جذبات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس پانچویں دَور کی ابتدا حالیؔ کی جدید شاعری سے ہوتی ہے اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی اور اُن کے بعد موجودہ زمانے تک قائم رہتی ہے۔ اس اجمالی ترتیب کے بعد اب ذرا تفصیل سے ہر دَور کی قصیدہ گوئی کی بابت نمونے دکھا کر زبان و بیان کی تدریجی ترقی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس دَور میں وَلی دکنی کے سوا اور کسی کا قصیدہ پیش نظر نہیں، بہت ممکن ہے کہ سراج اور رنگ آبادی، اور شاہ حاتم دہلوی نے بھی دو ایک قصیدے لکھے ہوں، مگر وہ چوں کہ سامنے نہیں اس لئے ان کا نمونہ نہیں دیا جاسکتا البتہ زبان و بیان کے متعلق یہ مان لینا بعید از قیاس نہیں کہ جس طرح غزل میں وَلی کے بعد سراج و حاتم و آبرو کی غزلوں میں تھوڑی بہت صفائی آگئی تھی۔ اسی طرح قصائد کا اسلوب بیان بھی کچھ نہ کچھ بدل چلا ہوگا۔ مگر نہ اتنا جتنا کہ دتی اور سودا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ وَلی کے ایک قصیدے کے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر معلوم ہوگا کہ اس میں نہ تشبیب ہے نہ گریز۔ نہ ہاتھی گھوڑوں کی تعریف ہے نہ ادر زوائد۔ ابتداہی سے ممدوح کی مدح شروع کردی ہے۔ اور چوں کہ وہ قصیدہ نعت شریف میں کہا گیا ہے اس لئے مذہبی نقطہ نگاہ سے الگ ہوکر دیکھا جائے تو تعریف میں مضامین وخیالات موزوں کئے گئے ہیں۔ جن کو فارسی شعرا التزاماً کہا کرتے ہیں۔ زبان بالکل ابتدائی ہے اور اس عہد کے الفاظ جس طرح عوام الناس کے روزمرہ میں داخل تھے بحرفہ وَلی نے نظم کر دیئے ہیں۔ بعض الفاظ مخصوص دکنی ہیں۔ جن کا استعمال ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں نہیں۔ چند شعر ایک نعتیہ قصیدے کے بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں اور اس انتخاب سے وہ اشعار جن میں پرانے اور دکنی الفاظ تھے نکال دیتے ہیں جن کے سمجھنے میں

وقت ہوتی ہے :-

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کو فانی کرے — ہو فنا فی اللہ، دائم یادِ یزدانی کرے
مرتبہ خلّت پناہی کا وہ پائے گا جو کئی — مثلِ اسمٰعیل اوّل جی کو قربانی کرے
وہی پاوے مطلبِ راضیۃً مرضیۃً — محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے
زندگی پاوے ابد کی جگ منیں وہ خضر وقت — جو اپس کو فدوی محبوبِ سبحانی کرے
یا محمدؐ دو جہاں کو عید ہے تجھ ذات سے — خلق کو لازم ہے جی کو تجھ پر قربانی کرے
جس مکاں میں ہو تمہاری فکرِ روشن جلوہ گر — عقلِ اوّل آگے واں اقرارِ نادانی کرے
کیا ملک کیا انس و جان یہ جگ میں ہے کس کو شکت — خط بنا تجھ مکھ کے جو تفسیرِ قرآنی کرے
دیکھ طوبیٰ قد ترا جنبش میں آوے شوق سے — جب گلستانِ ارم میں تو خرامانی کرے

ان اشعار میں مثل ہنین بمعنی میں۔ کئی بجائے کوئی۔ ہو، ہو کر کی جگہ۔ اپس بمعنی اپنے خط بنا تجھ مکھ کے بمعنی بغیر تمہارے خطِ رخسار کے۔ چند الفاظ ایسے ہیں جن کا استعمال بالعموم اُسی عہد کے لئے مخصوص ہے۔ ممکن ہے کہ حاتم وغیرہ کے ہاں اسی قبیل کے اور الفاظ مل جائیں مگر وہ تعداد میں بہت ہی کم ہوں گے۔ یہ خصوصی استعمال صرف ولیؔ اور اُن کے معاصر دکنی شاعروں کے سوا شمالی ہند میں نہیں۔ ابتدائی یا پہلے دَور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس عہد میں اُردو میں جا بجا فارسی زبان کے ترجمے کی شان بھی پائی جاتی تھی۔ مثلاً مندرجۂ بالا انتخاب میں، فدوی کرنا یا خرامانی کرنا۔ فارسی کا ترجمہ ہے فی زمانا اُردو میں یہ اندازِ بیان باقی نہیں رہا۔

اب دوسرے دَور میں سوداؔ وغیرہ کا نمونۂ کلام پڑھنا چاہئے جس کو پڑھ کر ذوقِ سلیم خود دونوں عہد کے زبانوں کا فرق محسوس کر سکے گا۔ منقبت حضرتِ امیرالمؤمنین حیدرِ کرار میں سوداؔ کے چند منتخب اشعار ہیں:۔

بسانِ دانۂ روئیدہ ایک بار گرہ ۔۔۔ کھلے جو کام سے میرے پڑے ہزار گرہ
مُقَیَّد اتنی ہے خاطر مری کہ جائے نفس ۔۔۔ کروں گا میں بدم واپسیں شمار گرہ
عجب نہیں عوضِ اشکِ چشم سے میری ۔۔۔ چوئے برنگِ سحاب تگرگ بار گرہ
نہ لٹ دھوئیں کی ہے یارب یہ زلفِ محبوباں ۔۔۔ رکھے ہے کیوں میری خاطر کو روزگار گرہ
فلک کو پہنچے ہے سرگرد بادِ مجھ دل کو ۔۔۔ جو ساتھ آہ کی پیچش کے ہو غبار گرہ
طرح ہلال کے ہوتا ہے ناخنِ تدبیر ۔۔۔ کشادہ کار ہمارے میں بذروار گرہ
علاج قتل ہے واشد کا اب مری کہ ندان ۔۔۔ پہنچتی ہے بدم تیغ استوار گرہ
غلط ہے تو جو زمانے میں سمجھے یہ سوداؔ ۔۔۔ کہ کار بستہ سے یاروں کی کھولیں یار گرہ
بغیر ناخنِ شیرِ خدا جہاں میں کوئی ۔۔۔ کسی کے کام کی کھولیں نہ زینہار گرہ
غضب کے پنجے سے جس کے برنگِ دانۂ اشک ۔۔۔ نہ آسماں کی ہو جائے تار تار گرہ

میر تقی میرؔ نے بھی چند قصیدے کہے ہیں۔ اُن کا اندازہ بیان بھی دیکھئے۔ وہ بھی منقبت حضرت مرتضیٰ علی میں فرماتے ہیں:۔

غنچے ہو دل پہ آتے ہیں اندوہ اب مدام ۔۔۔ پہنچے ہے مجھ کو داغ گل جنگ صبح و شام
اب کج روش تو نامہ نہ لکھ بھیج مت پیام ۔۔۔ قاصد کا میرے سیدھی طرح سے تو لے سلام

دل میں نہیں قطرۂ خوں آنکھیں ہیں گی تر — خالی پڑا ہے شیشۂ مے بھر رہے ہیں جام
ناکامیوں سے کام ، رکھا میں تمام عمر — گو کام دل حصول نہ ہو مجکو کیا ہے کام
صیاد نے اسیر کیا مجکو یہ عبث — میں ٹک جیا نہ فرط تپیدن سے زیر دام
اے طبع انتی ہرزہ سرائی جرس کی طرح — اس گفتگو سے فائدہ ، کہ حاصلِ کلام

یہ دوسرے دَور کی روش گویائی ہے ، جس سے گزشتہ زمانے کی رفتار صاف میز ہوتی ہے ۔ اس دَور میں بندش کی چستی ۔ بیان کی روانی ، خیالات و مضامین کی بلندی عہد اولین سے کہیں زیادہ استوار اور سنجیدہ ہے ۔ خط کشیدہ الفاظ و محاورات دیکھ کر معلوم ہوگا کہ بعض باتیں دونوں عہدوں میں مشترک نظر آتی ہیں ۔ مثلاً مجھ دل ۔ ندان ۔ ٹک ۔ طرح ہلال کے ۔ کشادہ کار ہمارے میں غنچے ہو ۔ وغیرہ یا ترجمہ فارسی مثل کام دل حصول ہو ۔ فرط تپیدن ۔ بایں ہمہ الفاظ کی پختگی اور متانت و شوکت ، مضمون آفرینی اور زور طبیعت ہر مصرع اور ہر شعر سے نمایاں ہے ۔ قصیدے کے معنوی اور تخیلی ترقی جو اس دور میں ہوئی ہے اُس سے زیادہ اس وقت تک کسی عہد میں پائی نہیں جاتی ۔ ہاں لفظی متروکات اور اسالیب بیان حسب موقع تیسرے اور چوتھے دور میں تغیر و تبدیل ضرور ہوتی رہی ہے ۔ اس دور میں مرزا رفیع السودا قصیدہ گویوں میں اس قدر شہرت یافتہ ہیں کہ میر تقی میر کی غزل گوئی کی طرح اُن کی قصیدہ نویسی بھی مسلم الثبوت اور اُن کی آیندہ نسلوں میں مجتہدانہ فکر سخن سمجھی جاتی ہے ۔ اس دَور کے آخری شاعر

اقتباً کا نمونۂ کلام انتخاب قصائد میں ملے گا - طوالت کی وجہ سے یہاں نہیں لکھا گیا ہے -

تیسرے دَور میں مومن - ذوق اور غالب کا شمار ہے - ان تینوں کے کلاموں کا نمونہ یہ ہے -

مومن در منقبت امیرالمومنین حضرت عمرؓ خطاب -

جو اس کی زلف کو دوں اپنے عقدۂ مشکل
تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل

تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں
میں نیم جان نہ رہا امتحاں کے قابل

امید حور بہشتی پہ لاؤں کیا ایماں
کہ برہمن ہوں تو دو کردۂ بتان چگل

وہ شوخ برق عنا خاک میں ملا دیوے
اگر وہ حسرتِ دُنبالہ گر دہی محمل

چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوق رسائی و دوری منزل

میں کیونکہ مطربۂ مہوش کو رام کروں
چلے نہ زہرہ پہ زنہار جادوے بابل

ایک اور قصیدے کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں جو حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں کہا گیا ہے:-

کوئی اس دَور میں جیے کیوں کر
ملک الموت ہے ہر ایک بشر

داد خواہوں کے شور سے دیکھو
چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر

آئینے نے بھی اس زمانے میں
تیغ کے سے نکالے ہیں جوہر

آتش نعل سینۂ جاں سوز
آب نیساں ہے ایک بدگوہر

جس کو دیکھو سو مایۂ بے داد　　کیا ہوا گر نہیں ہے سیمیں بر
ذکر انسان سے دیو مجنون ہو　　آدمی سے پری کو آئے حذر
ہے پئے اشتیاق دیدار انی　　شاہ فرہاد و بے ستوں کشور
نہ امیروں کو پائے بندیٔ علل　　نہ رعایا مطیع فرماں بر
اس کو سو رستم زماں کا خطاب　　جو کرے قتل خورد سالہ پسر
ہیں گدا پُر غرور شیر دیہ　　بے گنہ جو کیا ہے خون پدر

ذوق نے تہنیت سال گرہ اکبر شاہ ثانی کے موقع پر جو قصیدہ کہا ہے، اُس کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں:-

گردش میں چشم مست کی ہو دل مرا گرہ　　اور کھولے ہائے دانہ کی یوں آسیا گرہ
سینے میں دل اگر نہ گرہ تھا تو کس لئے　　ہر اشک میری آنکھ سے ہو کر گرا گرہ
اپنا دل گرفتہ چمن میں نہ وا ہوا　　غنچہ ہزار جا پہ کھلا اور ہوا گرہ
چلتا نہیں ہے پنجۂ مژگاں کا کچھ عمل　　ہے ایسی چشم تر سے بہم آشنا گرہ
آیا ہوں میں سرشت میں لے کر گرفتگی　　ہوویں گے استخواں بگولے ہُما گرہ
ہوئے گا شکل دست خابستہ حشر تک　　قاتل کے دست و دل میں مرِ خوں بہا گرہ
گو میں گرفتہ دل ہوں، تو جوں دانۂ انار　　محفل میں ہوگا خندۂ دنداں نما گرہ
یہ زہر غم چڑھا ہے کہ سبزہ بزیر لف　　سوجھے ہے یوں کہ زہر کی تھا یہ بلا گرہ
دل بستگی کا اپنی قلم بند کر کے حال　　بازو پہ مرغ دل کے اگر دوں لگا گرہ

کھائیں کبوتران گرہ باز کی طرح — سینے سے آن کر سر دوش ہوا گرہ
پھیلاؤں گر شمیم مضامیں کو ہند میں — ہووے ختن میں نافۂ مشک خطا گرہ
گہناتا ماہرو کا ہے کہتا کہ دیکھیو — قینچی کی طرح کترے ہے چرخ دوتا گرہ

مرزا غالب نے منقبت شیر خدا جناب علیؓ مرتضیٰ میں جو قصیدہ کہا ہے اُس کا نمونہ یہ ہے:-

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ — تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت رشتۂ شرار
سوپنے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم — سرنوشت دو جہاں ابر بہ یک سطر غبار
موج گل ڈھونڈھ بخلوتکدۂ غنچۂ باغ — گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
لعل سے ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ — طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا — چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار
فلک طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز — ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار
ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز — ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

اس تیسرے دَور کی زبان اور طرز بیان سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُردو زبان نے چند الفاظ اور تراکیب کے سوا وہ سب مدارج طے کر لئے ہیں جو اس دَور سوم کے بعد عہد چہارم میں جلوہ گر ہوئے۔ یعنی 'ہووے - دیویں - سوپنے ہے - کیجیو - جوں (مثل) کی طرح بعض پُرانے محاورات اس دَور میں ضرور موجود ہیں۔

لیکن اسلوب ادا بالکل وہی ہے جس کو متاخرین نے اختیار کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فارسی الفاظ۔ فارسی ترکیبیں زمانۂ مابعد سے زیادہ اس دَور تک پائی جاتی ہیں۔ اور خصوصیت لفظی کو دشل شان و شوکت۔ متانت و جزالت، قصیدے کے لئے اہل فارس نے لازمی سمجھا تھا۔ اس کی پوری پوری تقلید اس عہد تک اُردو زبان میں کی گئی ہے۔ اس عہد کے بعد جو زمانہ آتا ہے وہ ہماری قائم کردہ ترتیب کے مطابق دورِ چہارم ہے جس میں بحر۔ منیر۔ قدر۔ محسن۔ امیر اور داغ وغیرہ وغیرہ نے اپنے اپنے انداز خصوصی کا لحاظ رکھتے ہوئے قصیدے کہے ہیں۔ چوں کہ ان اساتذہ کی زبان بالکل وہی ہے جو آجکل بولی جاتی ہے۔ اس لئے اُن کے کلام کا انتخاب یہاں نہیں لکھا گیا۔ بلکہ اصل انتخاب میں اُن کے قصیدے درج کئے گئے ہیں۔

**انتخاب قصائد کی نوعیت اور اُن کی تعداد**

اگرچہ اُردو سخن آرائی میں سرمایۂ قصائد بمقابلہ دیگر اصنافِ سخن خصوصاً غزلوں کے مقابل میں کم ہے تاہم اتنا بھی کم نہیں جس کی کئی ضخیم جلدیں نہ بن سکیں لیکن یہ سمجھ کر کہ اگر سب شعرا کے تمام قصائد یکجا کئے جائیں تو اوّل اُن سب کا مل جانا دشوار ہے اور اگر مل بھی گئے تو اُن سب کی ترتیب و تدوین دشوار تر ہو جائے گی اور چوں کہ اس انتخاب میں قصائد کا اندراج صرف تاریخی اور ارتقائی حیثیتوں کے ماتحت کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کے سوا اور دوسرا طریقہ مناسب و موزوں نہیں معلوم ہوا کہ ہر دَور کے

مشہور قصیدہ گو شعرا کے چند قصائد لے لئے جائیں۔ اور اُن میں سے مفید مطلب اشعار چن کر درج کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اس التزام کے مطابق حسب ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:۔

۱۔ اُردو کے مشہور متقدمین شعرا میں سودا سے پہلے کسی اُستاد کی قصیدہ گوئی مسلم یا معتبر نہیں۔ اس لئے کوشش کی گئی ہے کہ جس طرح میں اُن کا قصیدہ ہو اُسی کے ہم طرح دوسرے شعرائے متاخرین کے قصائد لکھے جائیں جن کی کم سے کم تعداد ایک ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ جس قدر آسانی مل سکے۔

۲۔ قصائد کے انتخاب میں تشبیب و تمہید اور تخلص و گریز کا انتخاب ضرور کیا گیا ہے اور دعا و مدعا کے اشعار یا تو یک قلم خارج کر دیئے ہیں یا کہیں حسب موقع دو چار رکھدیئے ہیں۔

۳۔ مدح و ثنا میں مبالغہ و اغراق کے اشعار اتنے کم لکھے ہیں کہ نہ لکھنے کے برابر ہیں اور جس قدر لکھے ہیں وہ محض نمونے کے لئے۔

۴۔ دو چار قصائد کے سب اشعار رکھدیئے ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ اُن شعرا کو قصیدہ گو شاعر نہیں مانا اس لئے اُن کا پورا قصیدہ درج کر دیا ہے تاکہ ایک نقاد اچھی طرح پرکھ سکے۔

انتخاب کنندہ کو معلوم ہے کہ مندرجہ شعرا کے علاوہ اگر سینکڑوں نہیں تو بیسیوں شاعر ایسے گزرے ہیں جن کی نادر الکلامی اور اُستادی مسلم و معروف ہے۔

لیکن اُن کے قصائد اس مجموعے میں موجود نہیں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ انتخاب ولب لباب ہے نہ کہ طومار بے حساب۔

اس انتخاب میں کل کے قصائد کی تعداد ۶۴ ہے۔ جس میں زیادہ تعداد مرزا رفیع سودا کے قصیدوں کی ہے۔ اور اُن کے وہی قصیدے منتخب کئے ہیں جن میں دوسروں نے قصیدے لکھے ہیں۔ ورنہ منتخب قصیدوں کے مقابل میں سودا کے ایسے قصیدے موجود ہیں۔ جو بلحاظ مضمون آفرینی اور اسالیب بیان اُن سے بہتر ہیں۔ مگر چونکہ اُن بہتر کے ساتھ کوئی بدتر نمونہ بھی نہ مل سکا۔ اس لئے مجبوراً اُن کو چھوڑنا پڑا۔ مومن وغالب دنیائے شاعری میں جتنے مشہور ہیں سب جانتے ہیں مگر اتفاق کہ اُن کے قصائد کسی متقدم اُستاد کے قصیدے میں طرح نہیں اس لئے شہرت کو دیکھتے ہوئے اُن کے قصیدے کا نمونہ دکھانا ایسا گناہ شاعرانہ تھا جس کی بخشائش حشر تک نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اُن کے دو ایک نمونے انفرادی حیثیت سے پیش کر دیئے گئے ہیں۔

اِن قصیدوں میں سب سے پہلے جو قصیدہ ولی دکنی کا درج کیا گیا ہے اس کو محض تبرک سمجھنا چاہیئے نہ مقابل۔

تمہید اتنی مقدمہ نگاری کے بعد طلبہ کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے اُن اساتذہ کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں جن کے قصائد کا انتخاب اس مجموعے میں دیا گیا ہے۔ حالات پڑھنے سے پہلے یہ امر گوش گزار ضروری ہے کہ قصیدہ گو

شعرا کی فہرست موجودہ انتخاب سے بہت زیادہ ہے۔ مگر طوالت کے خیال سے ہر دَور کے چند قصیدے لکھدیئے ہیں جن کو پڑھکر اچھی طرح معلوم ہو سکیگا کہ اُردو زبان نے قصیدہ گوئی میں کس قدر اور کس حیثیت سے تدریجی ترقی کی ہے۔ اِن چار دَوروں کے سوا جو دورِ پنجم قائم کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ کہنا ہے کہ وہ نیچرل شاعری کا دَور ہے۔ اور جوں کہ قصیدہ گوئی قدیم سے صنائع وبدائع ۔ تشبیہات و استعارات ۔ مبالغہ و مجاز کا مخزن و معدن سمجھی جا رہی ہے اس لئے دَورِ جدید میں دنیائے شاعری سے تکلفات وتصنعات کو یک قلم خارج کر دیا گیا ہے ۔ اوّل تو قصیدہ گوئی کی اب ضرورت ہی نہیں رہی ۔ دوم یہ کہ جن معدودے چند اربابِ سخن نے اس میدان میں قدم اٹھایا ہے وہ یا تو اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے کے تعلیم یافتہ اور شعرائے متاخرین کے معاصر ہیں یا جو کچھ کہا ہے وہ دَورِ جدید کے مصلح بن کر کہا ہے۔ مثلاً شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ۔ یا خان صاحب مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اِن حضرات کے سوا کوئی طبقۂ جدید کا نمایاں شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس کو قصیدہ گویوں میں شمار کیا جا سکے ۔ باقی رہے وہ معاصر جن پر نیچرل شاعر کا لقب نہیں پھبتا اگر وہ قصیدہ کہتے ہیں تو باستثنا ئے بعض مضامین اسی انداز میں کہتے ہیں جس کو دَورِ چہارم کے اساتذہ لکھ گئے ہیں ۔ ان حالات کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اب قصیدہ گوئی اور خصوصاً سلاطین و اُمرا کے ثنا یا ان

شان قصیدہ گوئی مفقود و معدوم ہے۔ہاں نعت و منقبت یا مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں اس صنف سخن کا کسی نہ کسی خاص طبقے میں وجود باقی ہے۔

# اُن قصیدہ نویسوں کے مختصر و مفید حالات جن کا کلام اس انتخاب میں مندرج ہے۔

۱۔ولیؔ :۔ ولی اللہ نام۔ ولیؔ تخلص۔ اصلی وطن اورنگ آباد دکن مسکن و قیام زیادہ تر احمد آباد، سورت (گجرات)، میں رہا۔ ولادت بمقام اورنگ آباد ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۸ء میں ہوئی اور وفات بمقام احمد آباد ۱۱۵۵ھ / ۱۷۴۲ء میں واقع ہوئی۔ شعرائے اُردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو کا دیوان اس انداز سے ترتیب دیا جس کی تقلید اب تک جاری ہے۔ ولیؔ سے پہلے سلاطین قطب شاہی کے بعض دیوان ملتے ہیں۔ مگر اُن کی غزلیں اوّل تو ایسی دکنی زبان میں ہیں جن کو اُردو کہا جاسکتا ہے مگر سمجھا نہیں جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ ازروئے عروض اُن کے اوزان زیادہ ہندی زبانوں (تامل۔ تلنگو۔ بھاشا وغیرہ) سے ملتے جلتے ہیں اور سب سے زیادہ نمایاں یہ بات ہے کہ ان دیوانوں کی اکثر غزلیں ایک ہی وزن میں کہی گئی ہیں۔ تنوع اوزان اور مختلف بحروں میں صرف ولیؔ نے دیوان مرتب

کیا ہے اور وہی اب تک چلا جاتا ہے۔ اگرچہ ولی کے کلام میں بھی بکثرت دکنی اور نامانوس اور اجنبی محاورات والفاظ موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ قریب قریب پون حصہ دیوان کا ایسا ہے جو حاتم و آرزو کی زبان سے ملتا جلتا ہے۔ اور بعض اشعار تو ایسے ہیں جن پر آجکل کی زبان کا دھوکہ ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

ایک دن نہیں آرزو سے خالی ہر جاہے محال اگر خلا ہے

تو سر سے قدم تلک جھلک میں گویا ہے قصیدہ انوری کا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ولی کا دیوان متعدد بار چھپ چکا ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۳۳ء میں بمقام پیرس (فرانس)، باہتمام جے، ایل۔ گریسن ڈی ٹاسی اور سب سے آخر بمقام اورنگ آباد دکن باہتمام انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا تھا۔ ولی کے دیوان میں غزل۔ قطعہ۔ رُباعی وغیرہ کے سوا قصائد کی تعداد ۵ ہے۔ اور وہ سب حمد و نعت یا منقبت و مدح میں کہے گئے ہیں۔ یا تو اُن کو اس کا موقع نہیں ملا کہ وہ کسی دنیادار بادشاہ امیر کی جھوٹی سچی مدح گستری کے لئے قلم اٹھاتے یا فی الحقیقۃ وہ اپنے درویشانہ توکل و قناعت کے ماحول سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے، بہرحال اُن پانچ قصیدوں میں سے ایک قصیدہ اس انتخاب میں درج کیا گیا ہے۔ جس میں نہ تشبیب ہے نہ گریز۔ صرف حمد و نعت

یا موعظت کے مضامین سے لبریز ہے۔

**۲۔ سوداؔ**۔ مرزا محمد رفیع نام۔ سوداؔ تخلص۔ ان کے آباء و اجداد کابل کے معززین میں تھے۔ مرزا محمد شفیع اُن کے والد تجارت پیشہ تھے جو کابل سے دہلی آئے اور یہیں قیام پذیر ہوئے۔ حسبِ روایت تذکرہ آبِ حیات اُن کی ولادت ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء میں واقع ہوئی۔ مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خان وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اور فخر اُستاد بن کر مشہور ہوئے۔ وہ مسلم الثبوت شاعر مانے جاتے تھے اور اُن کی اُستادی کا چرچا اس قدر پھیلا کہ بادشاہ وقت شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب اُن کے شاگرد ہوئے اور کچھ دنوں اُن سے مشورہ کلام لیتے رہے۔ آخر عمر میں دہلی سے نکل کر چند سال نواب احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کے دربار میں رہے اُن کی وفات کے بعد فیض آباد آئے اور نواب شجاع الدولہ (لکھنؤ) کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہوئے اور پھر آصف الدولہ کے عہد تک لکھنؤ میں رہے اور ملک الشعرائی کا خطاب پایا اور چھ ہزار سالانہ وظیفہ پاتے رہے بالآخر ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء میں انتقال کیا۔ اُن کا کلام اور اُن کا حال مشہور انام ہے۔ اس لئے یہاں وضاحت تحصیل حاصل ہے۔ قصیدہ گوئی کے متعلق اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اُن کے مجموعۂ کلام میں ۴۱ اُردو قصائد میں جو نعت و منقبت کے علاوہ شاہ عالم نواب آصف الدولہ اور بعض دیگر امرا کی شان میں کہے گئے ہیں۔ اور دو چار قصیدے

ہجو اور شکایت زمانہ کے متعلق بھی لکھے ہیں۔ موخرالذکر منظومات کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ سودا قصیدہ گوئی کی استادی کی طرح عام طور سے ہجو گو بھی مشہور رہو گئے۔

اُن کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی اُستادوں کے قصائد کی برابری کرتے ہیں۔ نزاکت خیال۔ اور طرفگی مضامین میں وہ اکثر متقدمین اہل عجم سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ اور اُن کے معاصرین و متاقبین میں تو کوئی بھی اُن کا ہم پلہ نظر نہیں آتا اُن کی ہجووں کو اگرچہ یاوہ گوئی کہا جا سکتا ہے مگر بقول مترجم تاریخ ادب ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں۔ جو ابدالاباد تک شاداب و سرسبز رہے گا۔ اُن کی ہجو گوئی میں وہ گرمی کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ بن گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف سے اُن کو خلقی مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت تھی۔ بڑھاپے میں بھی اُن کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی ایسی تھی کہ جو بات دل میں آ جاتی تھی اُس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف اُن کو اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے سے روک نہ سکتا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے اس متبذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانے کی خرابیوں اور گمراہیوں کی پردہ دری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ جس طرح رومتہ الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے جوونیال[1] سے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں اُسی طرح اگر ہم کو زوال

---

[1] جولیس وینالس روما کا مشہور ہجو نگار متوفی ۱۲۸ء عیسوی ۱۲۔

دولتِ مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہے تو ہم کو چاہئے کہ سوداؔ کی اُن پرآشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں اُنھوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعۂ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارت گری کا سچا فوٹو اُتارا ہے یا جس زمانے کی پُرآشوب حالت اور امرائے دہلی کی تباہی و بربادی اور کس مپرسی کا بیان پُر زور اور دردناک طریقے سے کیا ہے۔

غرض کہ سوداؔ فی الحقیقۃ صنف قصیدہ گوئی میں اُردو کے لئے بے مثال نمونہ ہیں۔ قصائد کی وہ تمام خصوصیات جو ایرانی شاعری سے اُردو میں منتقل ہوئیں بتاما موجود ہیں۔ تشبیب کے بعد مخلص وگریز جس طرح اُن کے قصائد میں وست وگریباں نظر آتی ہے ایسی چسپید گی دوسرے نامور اساتذہ کے کلام میں نہیں۔ جس کا ثبوت اہل نظر کو اُن کے قصائد میں نظر آئے گا۔ اس انتخاب میں اُن کے ۱۲ قصائد مندرج ہیں۔ ہر قصیدے کی تمہید ایک خاص انداز رکھتی ہے۔ اور ہر انداز اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔

۳۔ **میر تقی میرؔ** ۔ محمد تقی خلف میر عبداللہ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ اور سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے سوتیلے بھانجے تھے۔ اسی سلسلے سے باپ کی وفات کے بعد دہلی آگئے اور خان آرزوؔ کے پاس ایک حد تک انھوں نے اور اُن کی شاعری نے پرورش پائی۔ اُن کے واقعات عام طور سے مشہور ہیں اور اکثر نصاب کی کتابوں میں مندرج ہیں اس لئے ذاتی حالات

بہت اختصار سے خانہ پُری کے لئے لکھے جاتے ہیں۔

شعر و شاعری کی شہرت کے بعد جب کہ دہلی کا دربار شاہی بربادی و تباہی سے ہم کنار ہونے لگا۔ تو میر صاحب کو ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں دلی چھوڑنی پڑی اور لکھنؤ کا رُخ کیا۔ وہاں جاتے ہی ایک مشاعرے میں جانا پڑا اور صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہوگیا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ نے سُنا اور دوسو روپے مہینہ مقرر کردیا۔ اب وہ کبھی کبھی نواب کے دربار میں جانے لگے۔ میر صاحب نازک مزاج بہت تھے جس کے متعلق اکثر و بیشتر واقعات مشہور ہیں۔ انھیں میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دن نواب آصف الدولہ نے بلا بھیجا جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے، پانی میں لال، سبز مچھلیاں تیرتی ہیں آپ تماشا دیکھ رہے ہیں، میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمائیے۔ میر صاحب نے غزل سُنانی شروع کی، نواب صاحب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوتے اور ہر شعر پہ ٹھہر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہے جاتے تھے ہاں پڑھئے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں سے کھیل رہے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں، نواب نے کہا۔ جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرلے گا۔ میر صاحب کو یہ

بات زیادہ ترناگوار گزری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جا رہے تھے نواب صاحب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نواب صاحب نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے ہمیں بالکل چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں، یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزر کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ میر صاحب میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ تھے۔ ہر کام متانت و آہستگی کے ساتھ کرتے۔ بات بہت کم کرتے اور وہ بھی آہستہ، آواز میں نرمی اور ملائمت۔ ضعیفی کی وجہ سے تمام جسم رعشہ دار تھا۔ مگر آواز میں بدستور خوش گوئی باقی تھی۔

ان کی تصنیفات میں غزلوں کے ۶ دیوان ہیں جن میں ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ مگر سب سے زیادہ غزلوں کا سرمایہ ہے اور اسی بنا پر اُن کو عموماً غزل گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن انھوں نے قصیدے بھی کہے ہیں اور اگرچہ وہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ یعنی صرف پانچ۔ جن میں ۴ منقبت میں اور صرف ایک نواب آصف الدولہ کی شان میں۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت میر صاحب کی طبیعت متوکلانہ اور قناعت پسند تھی اور بقول آزاد کہ توکل و قناعت انھیں بندوں کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے یا خود پسندی یا خود بینی

جو انھیں اپنے آپ عرق کئے دیتی تھی۔ وہ زبان سے کسی کی تعریف کلمے بنیں بچی تھی۔ بہرحال کوئی وجہ ہو اُن کے قصیدے مطالب کی دقت۔ مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کی شان وشکوہ، بندش کی چستی، اور برجستگی سے زیادہ مربوط نہیں۔ تشبیب وتمہید بھی معمولی ہے اور گریز اس سے زیادہ پامال۔ لیکن یہ کہنا حقیقت سے بعید ہے کہ اُن میں قصیدہ گوئی کی صلاحیت نہ تھی۔ خود دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگروہ خصوصیات قصائد کی طرف توجہ مبذول کرتی چاہتے ہیں تو اس میں بھی اپنی قادرالکلامی ثابت کرکے چھوڑتے ہیں۔ اس انتخاب کے دو ایک قصائد اس امر کا ثبوت ناظرین وناقدین پاسکیں گے۔ اُن کے قصائد بلحاظ اشعار بہت طویل نہیں ہوتے۔ تشبیب کا سلسلہ بھی دراز نہیں ہوتا زبان و بیان میں زیادہ تر غزل کی سی صفائی پائی جاتی ہے۔

---

۴۔ اِنشاؔ:۔ سید انشاء اللہ ولد حکیم میر ماشاء اللہ خاں سادات صحیح النسب سے تھے۔ اُن کے بزرگ نجف اشرف یا حظۂ کشمیر سے ہندوستان میں آئے۔ اور رفتہ رفتہ اُمرائے شاہی میں شامل ہوئے۔ میر ماشاء اللہ خاں دربار شاہی کے طبیب تھے۔ سلطنت مغلیہ کے ضعف میں میر ماشاء اللہ خاں، مرشدآباد گئے۔ اور نواب سراج الدولہ کی رفاقت میں مدتوں رہے۔ سید انشاء اللہ وہیں پیدا ہوئے۔ اور جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امیرزادے تعلیم پاتے

تھے۔ اسی طرح سید انشا کو سب سے ضروری علوم و فنون میں مہارت حاصل ہوئی۔ ایسا طباع اور عالی دماغ آدمی ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہوگا۔ وہ اگر علوم میں سے کسی ایک فن کی طرف متوجہ ہوتے تو صدہا سال تک وحید عصر گنے جاتے۔ طبیعت ایک ہیولی تھی کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی باوجود اس کے شوخی اس قدر کہ سیماب کی طرح ایک جگہ قرار نہ تھا۔ چنانچہ کلیات ان سب مراتب کے لئے محضر شہادت ہے۔ ان کی طبیعت بہیشہ آبائی وطبات (؟) پیدا نہ ہوئی لیکن پوں، کہ ایسے رنگا رنگ خیالات کا شاعری کے سوا اور فن میں گزارہ نہیں اس لئے شاعری کی طرف جھکے جس سے انھیں ربط خداداد تھا اور اس کوچے میں بھی اپنا رستہ سب سے جدا نکال کر داخل ہوتے۔ انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ابتدا میں اپنا کلام اپنے والد کو دکھایا اور بس۔ جب ہندوستان میں تباہی عام ہوئی تو سید انشا مرشد آباد سے دلی میں آئے۔ اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین شاہ عالم بادشاہ تھے، سید انشا بھی اہل دربار میں داخل ہوتے اور اپنے اشعار کے ساتھ لطائف و ظرائف سے کہ ایک چمن زعفران تھا گل افشانی کرکے محفل کو لٹالٹا دیتے تھے اور یہ عالم ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم کے لئے بھی جدائی ان کی ناگوار ہوتی تھی۔

دلی کا بادشاہ اس وقت خاہ شطرنج تھا اس لئے اس بساط سے ان کا دل اچاٹ ہوا، لکھنؤ میں آصف الدولہ کی سخاوتوں نے حاتم کے نام کا خاتمہ کردیا تھا۔

اور لوگ بھی کمال کے ایسے جویا تھے کہ جو دتی سے گیا پھر نہ آیا، سیّد انشا نے بھی اُدھر کا رُخ کیا، جاتے ہی علم و فضل کے زور اور کمال کے شور سے توپ خانے لگا دیئے کہ تمام مشاعرے گونج اٹھے اور اُسی نمک خواری قدیم کے سلسلے سے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہنچے۔ وہ شاہ عالم کے بیٹے تھے، باپ دادا کے خانہ زادوں پر شفقت واجب تھی۔ اس کے علاوہ شاعر بھی تھے پہلے مرزا سلیماں شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جب سید انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا۔ اور پھر علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچے اور ملازمت ہوتے ہی ایسے شیر و شکر ہوئے کہ پھر نواب کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا۔ سید انشا کے دربار کے تعلقات اور وہاں کے نشیب و فراز ایک داستانِ طویل ہے اور اس انتخاب میں اس کی تفصیل بے موقع ہے اس لئے کہ ان کے ابتدائی حالات کی اس قدر تشریح کافی سمجھی گئی۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اُن کی ہمہ گیر طبیعت کسی رنگ اور کسی روش پر بند نہ تھی۔ ان کی کلیات میں ہر قسم کی شاعری کے نمونے موجود تھے اور اس قدرت کلام کے ساتھ کہ جس صنف میں قلم اٹھاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسی میدان کے مرد میں۔ بایں ہمہ رنگ میں شوخ مزاجی اور تمسخر و ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ اُن کے مجموعہ کلام میں علاوہ فارسی قصائد کے دس قصیدے اُردو زبان

میں ہیں۔ جو حمد و نعت اور منقبت کے سوا بادشاہ عالی گہر۔ شاہزادہ سلیمان شکوہ۔ نواب سعادت علی خاں اور دلھن جان بیگم کی مدح و ثنا میں لکھے گئے ہیں۔ ایک طویل الذیل قصیدہ جارج سوم بادشاہ انگلستان کی تہنیت جشن میں کہا گیا ہے بقول شمس العلما آزاد اُن کے قصائد بڑی دھوم دھام کے ہیں، "الفاظ کا شکوہ طبیعت کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں مگر سیدھے چلتے چلتے ایک ایسی چال بدل دیتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے، وہ یہی بات تھی کہ اپنی زبان دانی کے جوش اور قوت بیانی کے مزے میں اگر کبھی کوئی شوخ مضمون کبھی کوئی خوش آیند ترکیب اور نئی تراش ایسی سوجھ جاتی ہے کہ اسے باندھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور وہاں قصیدے کی متانت اور وقار کے اصول ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ اس میں کبھی تو کلام میں شوخی اور ایک قسم کا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی مبتذل ہو جاتا ہے مگر پھر لطف یہ ہے کہ قدرتی لذت جو زبان میں ہے وہ کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی اور اسی واسطے جس دربار یا جلسے میں قصیدہ پڑھتے تھے۔ سبحان اللہ اور واہ وا کہنے کے سوا سننے والوں کو ہوش نہ ہوتا تھا اس بے اعتدالی کا سبب یہ تھا کہ طبیعت میں طاقت بہت تھی مگر اس پر قابو نہ تھا" اسی زور طبیعت کا نتیجہ ہے کہ وہ اُردو کہتے کہتے دوسری زبانوں میں شعر کہنے لگتے ہیں۔ اکثر قصائد ایسے ہیں جن میں عربی، فارسی، ترکی، اور ہندی بھاشا کے اشعار شامل کر دیتے ہیں۔ غرض کہ انشا کا تمام کلام ایک معجون

مرکب ہے کسی خاص رنگ کو دبجز شوخی وظرافت، اُن کا مخصوص رنگ نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہی سبب اُن کی عام نامقبولیت کا ہے ورنہ اُن جیسا مجموعہ کمال اردو شعرا میں دوسرا نظر نہیں آتا۔ اُن کے معاصرین شعرا میں مصحفی مشہور ومعروف اُستاد گزرے ہیں، جن سے اکثر معرکۂ سخن گرم رہا کرتا تھا۔

**۵۔ مومن**۔ محمد مومن خاں نام، مومن تخلص۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے عربی کتابیں پڑھیں۔ جب استعداد درست ہوگئی تو والد اور چچا غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اُن کی زیرِ نگرانی نسخہ نویسی کی۔ اُسی زمانے میں نجوم کا شوق پیدا ہوا اس کو بھی اہلِ کمال سے حاصل کیا۔ اور مہارت بہم پہنچائی۔ شعر وسخن سے طبعی مناسبت تھی، عاشق مزاجی نے اور بھی چمکایا، ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا، پھر ذہن خداداد کے اطمینان پر اصلاح لینی چھوڑ دی اور بطور خود مشق سخن کرنے لگے۔ رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع، خوش پوشاک اور عاشق مزاج آدمی تھے، اپنا کلام دردناک آواز اور دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین بلند ہوتے تھے۔ استعارہ وتشبیہ کے زور سے وہ بات پیدا کرتے تھے جو دل پر جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اس جامع کمال ہستی نے بہار زندگی کے صرف باون برس مزے لے کر ۱۲۶۶ھ ۱۸۴۹ء میں وفات پائی اور مہدیوں کی جانب

دہلی دروازے کے باہر حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے مقبرے کے پاس سپرد خاک کئے گئے۔ انھوں نے شاعری کے ذریعہ سے روپیہ پیدا کرنا پسند نہیں کیا اور نہ نجوم و رمل کو ذریعہ معاش بنایا، جو کچھ دہلی میں میسر تھا اسی پر قناعت کی اگرچہ چار یا پانچ مرتبہ دلّی سے باہر نکلے اور بدایوں سہسوان اور رامپور وغیرہ گئے اُن کے مجموعہ کلام میں غزلوں اور مرثیوں کے علاوہ ۹ قصائد بھی ہیں جن میں ۷ قصیدے علی الترتیب حمد و نعت اور خلفائے راشدین اور سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہم کی منقبتوں میں لکھے گئے ہیں اور ۸ و ۹ نواب وزیر خاں نصرت جنگ والی ٹونک اور راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی مدح و ثنا میں لکھے گئے ہیں۔ پختگی و روانی میں اگرچہ مومنؔ و ذوقؔ کی سلاست و فصاحت تک نہیں پہنچتے ہیں۔ لیکن زور اور ندرت کلام میں اُن کا مرتبہ دوسروں سے کم نہیں۔ تشبیب عموماً نادر ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ہر قصیدے میں تعلّی اور شکایت زمانہ جو تقریباً سنت شعراء ہے خاص شان و شکوہ سے کی جاتی ہے۔ تخلص یا گریز نسبتاً کمزور رہے۔ قصائد میں علمی مضامین بکثرت لاتے ہیں۔ اور چونکہ خود نجوم و رمل اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس لئے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اغلاق بڑھا دیتے ہیں۔ کہیں کہیں تلمیحات اور آیات و احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے ہیں۔ کلام میں خیالات کی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں بندشوں کی سستی اور نادرستی تعقید پیدا کر دیتی ہے فلسفہ

داخلاق ان کے کلام میں انشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔

مومن کے کلام میں کوئی قصیدہ مسودا۔ انشا اور ذوق کے قصائد کی طرح ان میں نہیں ملا اور چوں کہ حتی المقدور التزام کیا گیا ہے کہ اس انتخاب میں ہم طرح قصائد جمع کر دیئے ہیں اس لئے اُن کا ایک قصیدہ جس کے ہم وزن اور ہم طرح مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے بھی کہا ہے درج کیا گیا ہے اور دوسرا قصیدہ بطور نمونہ مفرد" رکھا گیا ہے۔

۶۔ ذوق ۔ شیخ ابراہیم، ذوق ولد شیخ محمد رمضان ارذی الحجہ ۱۲۰۴ھ مطابق ۲۳ اگست ۱۷۹۰ء یوم دوشنبہ کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے والد کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے اور نواب لطف علی خاں کے سپاہیوں میں نوکر تھے۔ ذوق کی تعلیم حافظ غلام رسول کے مکتب میں شروع ہوئی۔ حافظ صاحب شاعر بھی تھے اور شوق تخلص کرتے تھے۔ ذوق کو وہیں سے شاعری کا شوق شروع ہوا، جب کچھ عمر بڑھی تو شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے، کچھ دنوں بعد اُستاد سے بگڑ گئے۔ اور بلا اصلاح غزلیں پڑھنے لگے۔ بقول آزاد ۱۵-۱۶ برس کی عمر میں غزلوں کا پہلا دیوان مرتب ہو گیا تھا۔ مرزا ابوظفر ولی عہد اکبر شاہ جو بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے اور ظفر تخلص کرتے تھے اُن کے دربار میں اکثر مشہور شعرا کا مجمع رہا کرتا تھا، اور وہ شاہ نصیر سے اپنے کلام میں اصلاح لیا کرتے تھے، پھر میر کاظم حسین بیقرار اصلاح دینے لگے۔

ان دو نوں اُستادوں کے بعد ذوق کو یہ منصب تفویض ہوا۔ ابتدائی عہد کی سرکار سے چار روپے ماہوار کے حساب سے تنخواہ ملتی تھی۔ پھر پانچ اور اس کے بعد سات رُپے مشاہرہ ہوا اور جب ابوظفر بہادر شاہ تخت نشین ہو گئے تو سَو رُو پے مہینہ ملنے لگا۔ اُستاد ذوق کو ۱۹ سال کی عمر میں یہ قدرت کلام حاصل ہو گئی کہ لوگ اُن کو اُستاد تسلیم کرنے لگے۔ اسی عمر میں ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں پڑھا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے:۔

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن  آب و ایلولہ ہوئے نشوونمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا فرمایا۔ افسوس ہے کہ قصیدہ اب معدوم ہے۔ جب مرزا ابوظفر بادشاہ ہوئے تو ذوق نے ذیل کے مطلع کا قصیدہ تہنیت میں پڑھا:۔

روشن ہو تیرے رُخ سے کیا نورِ سحر رنگِ شفق  ہے ذرّہ تیرے پرتو انوار سحر رنگِ شفق

ایک مرتبہ جب بہادر شاہ نے سخت بیماری کے بعد شفا پائی تو زبردست قصیدہ ذوق نے پڑھا جس کا مطلع یہ ہے:۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا  مثل نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اس قصیدہ پر علاوہ خلعت کے خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ بعد کو ایک بڑا عالیشان قصیدہ لکھا۔ جس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔ اس کا مطلع یہ ہے:۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت     نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

غرض اسی طرح حسب حیثیت دربار شاہی اکثر قصائد و تہنیت خوانی پر انعام و اکرام اور خلعت پاتے رہے۔ ذوقؔ کو دلّی سے نہایت اُنس تھا۔ کبھی دلّی سے باہر جانا پسند نہ کیا۔ دیوان چندو لال نے دکن سے ایک مصرع طرح بھیجا اور دکن بلایا، آپ نے طرح میں غزل لکھکر بھیجدی جس کا مقطع یہ ہے:-

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن     کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

دیوان صاحب نے خلعت اور پانچ سو روپے بھیجے۔ گر خود دکن نہ گئے۔ اور بالاخر ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء جمعرات کے دن صبح ہوتے انتقال کیا۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر آپ نے وفات پائی۔ ۶۸ برس کی عمر تھی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا     کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شیخ ابراہیم ذوقؔ کو بہت سے علوم سے واقفیت تھی۔ تفسیر و تصوف میں دخل کامل تھا، ابتدائے زمانے میں موسیقی سے بھی شوق تھا، نجوم و رمل کو بھی نہ چھوڑا۔ علم طب میں بھی عبور تھا لیکن کبھی مطب نہ کیا۔ ان کے کلام کا کثیر حصّہ بالکل تلف ہو گیا اور خاص کر عالمِ جوانی کا کلام اب دست یاب نہیں ہے۔ غزلوں کے سرمایہ کثیر کے علاوہ اگر اُن کے قصائد کا مجموعہ باقی رہتا تو وہ خاقانی شروانی کے قصائد سے دوچند ہوتا۔

اُردو قصیدہ گویوں میں مرزا رفیع سوؔدا کے بعد خاقانیٔ ہند ذوقؔ کا مرتبہ سب سے بلند مانا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ پرانے انداز بیان کی اُن کے قصائد میں وہ تمام خصوصیتیں بحد کمال موجود ہیں۔ مذاق حال کے مطابق مبالغہ شاعرانہ کے خلاف کہا جاسکتا ہے کہ اکثر اشعار نیچرل شاعری کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ مبالغہ ایشیائی شاعری کی جان ہے۔ یہ طرز مشرقی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے۔ بغیر اس کے نظم بے نمک ہے۔ ہر سخن فہم مبالغہ کو خوب سمجھتا ہے۔ اور مبالغے سے قطع نظر کرکے صرف بلند خیالی کو دیکھتا ہے، مبالغہ کو تشبیہ و تمثیل کے برابر مانا جاتا ہے، اور مبالغہ آمیز تعریف کو کلیتہً سچ نہیں سمجھا جاتا۔ مبالغہ صرف ایک جامۂ زرّین ہے جس میں اصل خیال آراستہ کیا جاتا ہے، غرض صرف اعلیٰ مشابہت ہے۔ اس لئے مبالغہ کو خوبیٔ کلام سمجھنا چاہیئے نہ کہ نقص۔ کوئی زبان کوئی لٹریچر اس انداز بیان سے خالی نہیں۔ کمی و زیادتی۔ یا استعمال و غیر استعمال یا مزاولت و عدم مزاولت کی وجہ سے پسند و ناپسند کی گفتگو ہوتی ہے۔ مثلاً ہم روزمرہ سنتے ہیں کہ گرمی و سردی کی شدت میں کہا جاتا ہے کہ آگ برس رہی ہے۔ یا دانت گلے جاتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا صرف اظہار شدت کے لئے ایسا کہا جاتا ہے اور کوئی سننے والا یہ یقین نہیں کرتا کہ واقعی آگ برس رہی ہے یا دانت گلے جاتے ہیں۔ کسی مقام کے قریب کا اظہار کرتے وقت

کہا جاتا ہے کہ وہ جگہ یہاں سے دو قدم پر ہے حال آں کہ سو قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔
غرض کہ یہی حال ہر مبالغہ و تشبیہ میں پیش نظر آتا ہے اس کی وجہ سے کلام
میں شوکت پیدا ہوتی ہے نہ کہ پستی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ان سب مراتب کو
مرزا رفیع سودا کے بعد شیخ ابراہیم ذوق نے بہت ارفع و اعلیٰ کر کے دکھایا ہے
(اُن کے مجموعۂ کلام میں ۲۳ تمام و ناتمام قصائد ہیں، جن میں ۴ - ۵ تشبیدے
۴ - ۶ - اشعار سے زیادہ نہیں اور یہ سب کے سب ایک کے علاوہ جو حضرت
سید عاشق نہال چشتی کی شان میں کہا گیا ہے۔ اکبر شاہ ثانی یا ابو ظفر بہادر شاہ
کی مدح و ثنا میں کہے گئے ہیں۔)

۷۔ سحر۔ امان علی نام۔ سحر تخلص۔ باپ کا نام شیخ محمد امین لکھنؤ وطن
تھا۔ پہلے شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہوئے پھر برق سے تلمذ حاصل کیا۔
نہایت خوش گو اور سلاست پسند شاعر تھے، اگرچہ اُن کی شاعری میں بھی تلازمات
و رعایت لفظی کا وہی رنگ ہے جو اُس عہد میں تمام شعرائے لکھنؤ
پر چھایا ہوا تھا لیکن عام کلام میں سلاست کا عنصر بہت غالب ہے۔
اور اس خصوص میں وہ اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ آدمی
حسین اور جامہ زیب تھے، جب لباس پہنتے تو ایک رنگ کا پہنتے۔ جس کپڑے
اور رنگ کی ٹوپی اُسی کا انگرکھا، اُسی کا پاجامہ بلکہ جوتے پر بھی لباس کے
ہم رنگ کپڑے منڈھا ہوا ہوتا اسی کے ساتھ وارستہ مزاجی بھی طبیعت ثانی

بن گئی تھی۔ اکثر کتّل کی پوشاک کبھی گیروے کبھی صندلی مگر یک رنگ۔ مزاج بھی بے پروائی اور عیش و عشرت کی طرف زیادہ راغب تھا، وارستگی نے متروکۂ پدری سے دست بردار کردیا تھا چنانچہ ایک رباعی میں کہتے ہیں:۔

ترکے کے لئے کون عزیزوں سے لڑے ‌ ‌ جیتے ہیں سدا دہر میں چھوٹے نہ بڑے
باپ آج موا بیٹے کو کل مرنا ہے ‌ ‌ دو دن کے لئے کون بکھیڑے میں پڑے

امیروں کی نوکری کے بھی زیادہ خواہش مند نہیں ہوئے مگر اُن کی محفلیں گرم رکھا کرتے تھے۔ ہاں نواب محمد احسن خاں کی سرکار میں کچھ دنوں کے لئے ملازم ہو گئے تھے مگر خدا جانے کس طرح بسر کی۔ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

لکھنؤ میں آجکل جتنے طبیعت دار ہیں ‌ ‌ بندۂ احسان ہیں سب نواب فیض آثار کے
دامِ گیسوئے سخن کی یہ کشش ہے اے سحر ‌ ‌ ہم سے آزاد اور یوں پابند ہو دربار کے

امجد علی شاہ بادشاہ کے وقت میں شاہی دربار سے بھی توسل ہو گیا تھا شاہی دربار میں مشاعرہ بھی ہوتا تھا اور وہاں اُن کو جانا بھی پڑتا تھا۔ ایک مقطع میں لکھتے ہیں:۔

ایسی قسمت تو کہاں روز قدم دیکھے سحر ‌ ‌ طرح جب ہوتی ہے تو اُس کی طلب ہوتی ہے

کچھ دنوں مفلسی سے تنگ حال بھی رہے اور غدر کی بھاگڑ میں مختلف مقامات میں پیدل سفر کرتے رہے، بعد غدر جب امن عام کا اشتہار ہوا تو لکھنؤ آرہے تھے کہ راستہ میں کسی گاؤں کے قریب ہیضہ کر کے انتقال کیا۔ سنہ وفات ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۹ع ہے۔

نہ اُس گاؤں کا نام معلوم نہ اُن کے مزار کا پتہ۔ سچ ہے کہ شاعر کی زبان فال ہوتی ہے خود کہہ گئے تھے :-

دنیا میں نام مرد بہ از مرد ہے سحرؔ　　　یوں مریئے گور کا بھی نہ باقی نشاں رہے

ان کا مختصر دیوان چھپ گیا ہے جس میں غزلیات، مخمسات و مسدسات اور مثنویات وغیرہ کے علاوہ، قصائد بھی ہیں۔ جن میں چند قصائد مختصر اور نامکمل سے ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اُن کی شاعری میں سلاست زبان کا عنصر غالب ہے وہی رنگ اُن کے قصائد میں بھی پایا جاتا ہے۔ اکثر قصیدوں میں بہاریہ تمہید بطور تشبیب بہت اچھی لکھی ہے مگر مخلص و گریز بہت معمولی ہے، اور زبان متانت قصائد کے لئے موزوں نہیں۔ بایں ہمہ انداز بیان نہایت دلچسپ اور دل آویز ہے۔ ان کے ممدوحین میں امرائے لکھنؤ اور شاہان اودھ کے سوا بہادستان عیش باغ وغیرہ کی تعریفیں زیادہ ہیں۔ ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی انتزاع سلطنت کے بعد لکھا ہے جس کا انتخاب اس مجموعے میں دیا گیا ہے اُس کو شہر آشوب کہنا چاہیے۔ جس میں سحرؔ نے نہایت روانی اور موثر طریقے سے شہر اور اہل شہر کی حالت دکھائی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ مجموعی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ سحرؔ قصیدہ گوئی میں ملکہ تام رکھتے تھے۔ اور اُن کے قصائد کو پڑھ کر اُن کو اس کوچے سے نابلد نہیں مانا جا سکتا۔

**۸۔ غالبؔ**۔ اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ لقب، نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب، پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے پھر بمناسبت اسد اللہ الغالب غالبؔ اختیار کیا۔ والد کا نام عبد اللہ بیگ تھا۔ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں بمقام اکبر آباد پیدا ہوئے۔ جب پانچ برس کے ہوئے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ۱۳ برس کے سن میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے شادی ہو گئی۔ اس تقریب سے دلی میں آ رہے۔ مگر زندگی بھر گھر نہیں بنایا، دوستوں کے گھروں میں مستعار رہے، یا کرائے کے مکانوں میں عمر کاٹ دی۔ بیٹے بیٹیاں بہت سی ہوئیں مگر سب چھٹپنے میں مر گئیں۔ آخر میں بیوی کے بھانجے نواب زین العابدین خاں عارف کے دو یتیم بچوں کو لے کر پرورش کیا اور انھیں کو بیٹا بیٹی سمجھتے رہے مرزا شگفتہ مزاج تھے۔ ذہن و ذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی لاجواب رکھتے تھے، شوخی اور ظرافت اُن کے دم قدم کے ساتھ تھی۔ تحریر ہو یا تقریر کوئی بات لطافت و ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی "عربی میں صرف و نحو کے سوا اُستاد سے اور کچھ نہیں پڑھا تھا مگر چوں کہ علم سے فطری مناسبت تھی۔ اُن کی اُردو فارسی نظم و نثر کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص عربیت سے ناواقف ہے۔ مُلا عبد الصمد سے ایرانی اُستاد کی صحبت میں فارسیت کا رنگ اُن کی قوت متخیلہ پر خوب چڑھ گیا تھا۔ ابتدا میں غالبؔ نے مرزا عبد القادر۔ بیدل کا کلام زیادہ دیکھا اس وجہ سے جو روش مرزا بیدل نے

فارسی میں اختراع کی تھی انھوں نے اُردو میں اسی پر چلنا شروع کیا۔ چنانچہ ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب ایسے اشعار اب بھی موجود ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق بمشکل ہو سکتا ہے۔ خصوصیات شاعری میں مرزا غالب اپنے نئے تخئیل، اچھوتے انداز بیان، مناسبت تشبیہہ اور ظرافت آمیز متانت کی وجہ سے تمام شعرا میں بے مثال اور بے نظیر ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام کی بنیاد ایسے نادر اسالیب بیان پر رکھی جس کو اور شعرا نے عموماً چھوا تک نہیں وہ مبتذل تشبیہات جو بکثرت دوسروں کے کلاموں کی پائی جاتی ہیں اُن کے اشعار میں یکسر مفقود ہیں۔ متانت و سنجیدگی کو شوخی و ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ اُن کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بظاہر اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد دوسرے نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں خلاصہ یہ کہ مرزا غالب اپنی نوعیت سخن سرائی میں تمام معاصرین شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور اپنے بعد موجودہ زمانے میں جس قدر اُن کی پرستش ہو رہی ہے اس کے سامنے اگلے پچھلے سب شعرا مغلوب ہو گئے ہیں آخر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا تھا۔ کانوں سے سنائی نہیں دیتا تھا نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے، بالآخر ۷۳ برس کی عمر پاکر ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء میں وفات پائی اور درگاہ شاہ نظام الدین اولیاؒ میں دفن کئے گئے۔ اُردو کا مجموعۂ کلام بہت مختصر ہے۔ غزلوں اور قطعات کے سوا

صرف ۲ قصیدے انھوں نے کہے اور وہ بھی بہت مختصر اور غالباً اپنی اُسی طبیعت جدت پسند اور غیر مقلدانہ روش کی بنیاد پر کوئی قصیدہ کسی دوسرے کے ہم طرح قصیدے میں نہیں کہا۔ اس انتخاب میں دو قصیدوں کا انتخاب اندراج کیا گیا ہے۔

۹۔ **منیر**۔ سید اسمٰعیل نام، منیر تخلص، باپ کا نام سید احمد حسین المخلص بہ شاد۔ شکوہ آباد۔ ضلع مین پوری وطن، وہیں ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اردو دیوان منتخبات عالم کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اس میں انھوں نے اکثر اپنی زندگی کے ابتدائی حالات درج کئے ہیں۔ پہلے شیخ ناسخ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح سخن لیتے تھے۔ پھر کانپور میں جب کہ منیر نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہنچے تو یہ اُن سے ملے اور شاگرد ہو گئے۔ اور پھر انھیں کی ہدایت پر میر علی اوسط رشک سے بھی مشورۂ سخن کرنے لگے۔ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگوں کا ذکر نہیت ادب و احترام سے کرتے ہیں۔ منیر کلکتہ، مرشد آباد اور الہ آباد میں رہے، مگر لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے، یہاں کی دلچسپیاں انھیں مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت یہیں اختیار کریں۔ اور شعر و شاعری کے جلسوں میں برابر شریک رہیں۔ اس شوق کا ذکر اکثر اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں وہ کم سے کم ایک مرتبہ سال بھر میں ضرور آتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کے سفر

میں مظفر الدولہ نواب اصغر علی خاں کی سرکار میں ملازم بھی ہو گئے مگر پھر کچھ دنوں کے بعد کانپور واپس چلے گئے جہاں تھوڑے زمانے تک رہنے پائے تھے کہ لکھنؤ کی کشش نے پھر کھینچا اور اب کے مرتبہ نواب سید محمد آزو کی کے سلسلۂ رفقا میں داخل ہو گئے اور اُن کے کلام کی اصلاح دینے لگے۔ لکھنؤ میں ڈیڑھ سال قیام کرکے نواب تجمل حسین خاں کی فرمائش پر فرخ آباد گئے۔ اور نواب موصوف کی زندگی تک وہیں مقیم رہے اس عرصے میں مہاراجگان دھول پور اور الور نے اُن کو اپنے درباروں میں طلب کیا۔ مگر وہاں نہ جا سکے اور باندے میں ملازمت کرلی۔ جہاں نواب بہادر والیٔ ریاست کے اُستاد مقرر ہو گئے۔ بعد غدر ایک قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی اور جزیرۂ انڈمان بھیج دیئے گئے۔ پھر ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی پائی اور بعہد نواب کلب علی خاں رام پور میں قیام پذیر ہوئے اور یہیں ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں پیوند زمین ہوئے۔

منیر نے تین اُردو دیوان یادگار چھوڑے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی ایک معتدبہ سرمایہ کلام موجود ہے۔ وہ نہایت پُرگو شاعر تھے اور تمام علوم مروجہ خصوصاً ادب عالیہ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان کے اُردو قصائد کی تعداد ۲۸ ہے۔ جن میں ۴-۹ ابتدائی قصائد نعت و منقبت میں ہیں باقی اُن امرا و والیان ملک کی شان میں ہیں جہاں جہاں

وہ متوسل رہے ہیں۔ زیادہ تر نواب کلب علی خاں والی رام پور کی تعریف میں قصائد لکھے گئے ہیں۔ ان کی پُرگوئی نے ہر قصیدے کو طویل الذیل بنا دیا ہے۔ اور کسی قصیدے میں تقریباً کوئی قافیہ انھوں نے نہیں چھوڑا ہے۔ مضامین و تخیل کے لحاظ سے منیرؔ نہایت کامیاب قصیدہ گو ہیں۔ طبیعت کی روانی ہر موقع پر اپنا خاص اثر دکھاتی ہیں۔ ان کی قادر الکلامی مسلم الثبوت ہے۔ تشبیب و تمہید بہت پسندیدہ ہوتی ہے۔ چوں کہ منیرؔ کی عمر کا اکثر حصہ پریشانی اور آوارہ گردی میں گزر رہا ہے اس لئے اُن کے بعض قصائد اُن واردات قلبی کا آئینہ ہیں۔ انھوں نے نہایت وضاحت سے اپنے واقعات قیدو الم لکھے ہیں اور مذہبی زاویۂ نگاہ سے نعت و منقبت میں اپنے دردِ دل کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قصائد میں لفظی شان و شوکت اور معنوی بلندی و رفعت جس قدر ضروریات فن میں شامل ہیں وہ سب ان کے اشعار میں موجود ہیں۔ قصائد کے تمام مراتب تشبیب سے عرض حال اور دعا تک اپنے اپنے موقع پر پوری قوت کلام کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس انتخاب میں جن قصائد کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ اُن کو پڑھ کر اس کا ثبوت مل سکے گا۔

۱۰۔ **قدرؔ**۔ سید غلام حسین نام۔ ولد سید خلف علی۔ وطن بلگرام سنہ ۱۲۴۹ھ/۳۴-۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ ان کے نام سے یہی سنہ برآمد ہوتے ہیں۔ بلگرام ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے جس کی شہرت تفصیل و تشریح کی محتاج نہیں۔ قدرؔ بلگرامی

ایک جوہر قابل اور مسلم الثبوت اساتذہ فن سے گزرے ہیں۔ عربی و فارسی کی استعداد رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ گئے اور وہیں طالب علمی کے سلسلے میں شعر و سخن کا شوق ہوا۔ اوّل شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے اور قدر تخلص رکھا۔ پھر میرزا محمد رضا برق لکھنوی سے فن عروض و قافیہ حاصل حاصل کیا۔ اس فن سے اُن کو ایسی مناسبت تھی کہ لکھنؤ سے شہر میں شعرا اُن کی تحقیقات کو مسلم الثبوت خیال کرنے لگے۔ اس فن میں ان کی کتاب قواعد العروض (اردو) ایک لاجواب دستور العمل ہے۔ سحر و برق کے بعد شیخ امداد علی بحر کو بھی قدر نے اپنا کلام بغرض اصلاح دکھایا اور اس کے بعد دہلی جاکر غالب سے بھی تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ وہ اپنی ایک رباعی میں اپنے استادوں کے نام اس طرح گناتے ہیں:-

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند
پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر
بدنام کنندۂ نکو نامے چند

لکھنؤ اور پنجاب میں مختلف اور معمولی ملازمتوں کے بعد مرزا عباس بیگ دہلوی (ہمشیر زادہ مرزا غالب)، اکسٹرا اسسٹنٹ ضلع ہردوئی کی سفارش سے ہائی اسکول ہردوئی کی فارسی مدرسی پر فائز ہوئے، پھر مہونا تحصیلی اسکول ضلع لکھنؤ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آخر میں اورینٹیل ڈپارٹمنٹ کیننگ کالج لکھنؤ کے فارسی مدرس ہوئے۔ جہاں ساڑھے سات برس رہ کر فرائض منصبی ادا کئے۔ محکمۂ تعلیمات سے اُن کا تعلق ۱۸۸۳ء تک رہا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے

مختلف علوم و فنون مثل ریاضی و سنسکرت و عروض و نیگل وغیرہ میں کافی مہارت حاصل کی۔ ۱۲۸۵ھ میں بتوسل نواب سرور جنگ اُستاد حضور نظام دکن۔ اثنائے سفر کلکتہ بمقام بنارس بتقریب مسند نشینی آصف جاہ سادس کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوا اور قصیدہ تہنیت نذر گذرا جس کے صلے میں ملبوس خاص عطا ہوا اور امیدوار ملازمت ہو کر ہمرکاب بندگان عالی کلکتہ جا کر حیدرآباد پہنچے اور چار سو روپے ماہوار ملازم آصفیہ ہوگئے۔ قدرؔ مرحوم نہایت ضعیف الجثہ تھے۔ اس پر ضیق النفس اور ضعف معدہ جو اکثر لاحق حال رہا کرتا تھا۔ اختلاف آب و ہوا سے اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ آخر کار بسبب ضعف و بیماری حیدرآباد سے بغرض معالجہ لکھنؤ آئے لیکن وہاں بھی کوئی تدبیر سودمند نہ ہوئی اور باون برس کی عمر میں ۲۲ ذیقعدہ سنہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء بروز یک شنبہ شہر لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں میر خدا بخش کی کربلا میں پیوند زمین ہوئے۔

قدرؔ مرحوم نہایت خوش گو شاعر اور محقق فن تھے۔ اقسام شاعری میں ہر صنف کا کلام اُن کی کلیات میں موجود ہے۔ مگر اہل بصیرت دیکھ سکتے ہیں کہ بخصوصیت قصائد میں وہ جس قدر زور قلم دکھاتے ہیں دوسری روشوں میں وہ رفتار نظر نہیں آتی۔ اُن کے قصائد کی تعداد سات ہے اور ہر قصیدہ معرکۃ الآرا ہے۔ تشبیب و تمہید کے وہ بادشاہ تھے۔ جس مضمون پر تشبیب لکھی ہے لاجواب اور بے مثال لکھی ہے۔ دل بادل والے قصیدے میں سودا کے بعد بہت سے خوش فکر شعرا

نے اس طرح میں طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اور سب نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے لیکن قدر نے اپنے قصیدے کے ہر حصے میں جس کامیابی سے اپنی رسائی فکر اور بلندی تخئیل کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر نہیں۔ یہ قصیدہ (۲۳۰) اشعار کا ہے۔ تشبیب جس انداز سے شروع کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے تشبیب کے بعد مخلص و گریز کا مضمون اتنا دلچسپ اور مضمون ماسبق سے ایسا دست و گریبان ہے کہ اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر اُن کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً قصیدہ گوئی میں تمام معاصرین سے گوے سبقت لے جاتے اور اب بھی جس قدر زور کلام اُن کے قصیدوں میں پایا جاتا ہے قابلِ قدر ہے۔ عموماً قصائد کے اشعار انفرادی حیثیت سے ہم قافیہ ہوا کرتے ہیں۔ مسدس و مخمس میں بہت کم کہے جاتے ہیں۔ اس انتخاب میں مسدس کے ڈیڑھ ایک نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ قدر کے قصائد میں ایک مخمس کی صورت میں بھی پایا جاتا ہے جو سر مہاراجہ مان سنگھ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کی مدح میں کہا گیا ہے۔ جس کے چند بند انتخاب میں شامل کر دیئے گئے۔

۱۱۔ امیرؔ۔ امیر احمد نام۔ امیرؔ تخلص، خلف اکبر مولوی کرم محمد نسبی سلسلہ حضرت شاہ مینا سے ملتا ہے جن کا مزار لکھنؤ میں زیارت گاہ انام ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے نام کے ساتھ مینائی لکھا جاتا ہے۔ عربی و فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ فن سخن میں سید مظفر علی اسیر لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء سے

---

صہ امیر مینائی ۱۸۲۸ء / ۱۲۴۴ھ میں بمقام لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

پہلے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے دربار سے متوسل رہ کر مختلف خدمات پر مامور رہے۔ لکھنؤ کی تباہی کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے قدردانی فرمائی اور اپنی ریاست میں عدالت دیوانی کا رکن بنایا۔ اسی عہدے کے سبب سے آپ مفتی کہے جاتے۔ خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والی رامپور کے عہد میں آفتاب اقبال و کمال نے خاص عروج پایا یہاں تک کہ نواب ممدوح کی اُستادی کا فخر بھی منشی صاحب کو حاصل ہوا۔ ایشیائی شعرا کے دورِ آخر میں جس کو ابھی پچاس برس نہیں گزرے تھے امیر مینائی اساتذہ نامور کی صف اولین میں صدارت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ نعتیہ دیوان و مثنویات کے علاوہ عاشقانہ رنگ میں آپ کے دو دیوان طبع ہو چکے ہیں اور بقیہ سرمایہ غیر مطبوعہ ہے۔

امیر اللغات نامی ایک لغت بھی آپ کی یادگار ہے جس کی دو جلدیں الف ممدودہ و الف مقصورہ شائع ہو چکی ہیں۔ اسی لغت کی تکمیل کے خیال سے آپ نے حیدرآباد دکن کا سفر کیا، وہاں پہنچتے ہی تقدیر الٰہی سے ایسے علیل ہوئے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔ اور بالآخر جمادی الاخریٰ $\frac{۱۳۱۸}{۱۹۰۰}$ھ میں وہیں انتقال کیا۔

ہندوستان میں آپ کے سیکڑوں نامور شاگرد موجود ہیں، آپ کی شہرت و نام آوری مثل آفتاب کے روشن ہے اس لئے مزید وضاحت تحصیل حاصل سمجھی گئی۔ آپ کے مجموعہ کلام میں قصائد کی تعداد ساٹھ ہے جو صرف دیوان مراۃ الغیب کے ساتھ چھپے ہیں۔ اُن کے علاوہ نعتیہ قصائد اور

چند مدحیہ قصائد بصورت مسدس دیوانوں سے الگ مطبوعہ وغیر مطبوعہ بھی موجود ہیں۔ منشی صاحب کی جامعیت و قابلیت ہر طرح قصیدہ گوئی کے لئے بہت موزوں پائی جاتی ہے۔ اُن کے قصائد میں متانت الفاظ، بلندی تخئیل اور تمام محاسن معنوی کی بہتات ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ غزلوں کے مقابل میں صرف قصیدہ گوئی پر اپنا زورِ طبیعت صرف کرتے تو یقیناً اس صنف میں ایسا امتیاز خصوصی حاصل کرتے جو دوسرے قصیدہ گویوں کو نصیب نہ ہوتا۔ بعض قصائد میں سوال وجواب اور مناظرہ و مقابلہ کے پیرائے میں جو علمی و ادبی فوائد پائے جاتے ہیں وہ اس دعوے کے شاہد عادل ہیں تشبیب وتمہید اور گریز و مخلص کے انداز بھی نہایت دل آویز طریقے سے اُن کے قصائد میں نظر آتے ہیں۔

۱۲۔ **داغ**۔ نواب مرزا خان نام، داغ تخلص نواب شمس الدین برادر کلاں۔ نواب ضیاء الدین خاں میر رئیس لہارو کے بیٹے تھے۔ اُن کی ولادت ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء بمقام دہلی ہوئی۔ ۱۸۵۵ء تک دہلی کے شاہی قلعہ سے متعلق رہے۔ اور تباہی دہلی کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے پاس چلے آئے اور خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے عہد میں خاص شہرت وعزت پائی۔ نواب موصوف کے فراش خانے اور توشہ خانے کے مہتمم اور اصطبل کے منتظم رہ کر حسن خدمات کے صلے میں مختلف صلات وانعامات

سے فیض یاب ہوئے اور انھیں کے ساتھ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے
قدردان نواب کی وفات کے بعد کچھ دنوں بیکار رہے۔ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد
دکن گئے۔ اس حاضری میں صرف ایک مرتبہ حضور نظام دکن آصف جاہ
سادس کے سلام کا شرف حاصل ہوا۔ بالآخر ۴ برس امید داری کرنے کے
بعد ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء فرمان آصفی نافذ ہوا کہ داغ استاذ السلطان مقرر کئے گئے
اور جہان استاذ ناظم یار جنگ دبیر الدولہ نواب فصیح الملک کے خطابوں
سے سرفراز فرمایا۔ ان کو دربار دکن سے بے شمار صلوں کے علاوہ ایک ہزار
روپیے ماہوار ذات خاص کے لیے اور ایک گاؤں عطا ہوا جو اُن کے تصرف میں آخر
وقت تک رہا۔ اٹھارہ برس تک حیدرآباد میں قیام کرنے کے بعد ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء
کو وفات پائی۔ مرزا داغ اگرچہ علمی درس و تدریس میں رسمی فارسی و اُردو کے سوا
کوئی خاص قابلیت نہیں رکھتے تھے لیکن مادۂ شاعری اور ملکِ سخن آفرینی قدرتِ
ازل نے جس وسعت و فراخی کے ساتھ اُن کو عطا فرمایا تھا اُس کی مثال کسی اور شاعر
میں نہیں ملتی۔ اُن کی طرز۔ اسلوبِ بیان میں جس سلاست و فصاحت کا اثر
ہے وہ ایک جادو ہے جس کو ایک دنیا مان رہی ہے۔ اُن کے کلام کا بانکپن
شوخی و رنگینی لاجواب و بے مثال ہے۔ نہایت زود گو اور برجستہ کہنے والے
اور پھر اس روانی کے ساتھ کہ مخالف سا مخالف داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا
اپنے معاصرین میں اُن کا کلام جس قدر اُردو کے الفاظ و محاورات پر حاوی ہوتا

سرمایہ دوسروں کے کلام میں نہیں۔ عربی و فارسی کے الفاظ اور بعید الفہم استعارات و تشبیہات کے نظم کرنے سے ہمیشہ انھوں نے پرہیز کیا۔ اُن کی شوخیاں اور خوش بیانیاں مسلم ہیں، غرض کہ نواب مرزا داغ حریف ظریف خوش طبع اور رنگین مزاج تھے۔ حسن و عشق کے معاملات اور عاشق و معشوق کے خیالات جو غزل کی جان اور مجازی شاعری کی روح ہیں۔ اُن کے سارے کلام میں اوّل سے آخر تک ایک رنگ میں نظر آتا ہے۔ غزلیات کے چار دیوان اور ایک مثنوی فریاد داغ ان سے یادگار ہیں۔ اگرچہ اُن کا سرمایہ سخن زیادہ غزل سرائی پر مشتمل ہے، مگر گلزار داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ میں جو ۴۔۶ قصیدے دیکھے جاتے ہیں اُن کو پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ قصیدہ گوئی سے قاصر و مجبور تھے۔ دکن اور چمن کے نوانی کا جو قصیدہ اس انتخاب میں درج کیا گیا ہے وہ حیدر آباد کی حاضری اوّل میں دربار آصفی میں پڑھا گیا تھا اس کی تشبیب و تمہید اور تخلص و ترتیب اُن سب مراتب کے لحاظ سے مکمل ہے جو قصیدہ کے لئے لازمی و ضروری ہیں۔ پھر اُن کی طبعی اور جبلی سلاست و فصاحت سونے پر سہاگہ ہے۔

۱۳۔ محسن کاکوروی۔ محمد محسن نام محسن تخلص والد ماجد کا اسم مبارک مولوی حسن بخش۔ علوی سید تھے۔ قاری محمد صدیق (المعروف بہ ابو محمد خانی) اس خاندان کے اوّل شخص تھے جنھوں نے ہندوستان میں قدم رکھا اور رفتار امیر

سیف الدین نے عہد سلطنت سکندر یا ابراہیم لودھی میں بمقام کاکوری ضلع لکھنؤ بود و باش اختیار کی۔ چنانچہ ان کی اولاد کا وطن مالوف اس وقت بھی قصبہ ہے۔

حضرت محسن ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) بمقام کاکوری پیدا ہوئے سات سال کی عمر سے اپنے جد بزرگوار مولوی حسین بخش شہید کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی جو بسلسلۂ ملازمت سرکار انگریزی سے وابستہ تھے۔ اور ضلع اٹاوے میں ۱۲۵۰ھ میں حالت نماز میں شہید کئے گئے۔ محسن کے والد ماجد بسلسلۂ ملازمت مین پوری میں رہتے تھے اُن کی نشو و نما بھی وہیں ہوئی۔ ابتدائے عمر سے عبادت اور ریاضت زہد و تقویٰ کے شاغل و عامل رہے۔ اسی کے ساتھ فن سخن سے بھی ذوق رہا۔ مولوی ہادی علی اشک اُن کے خالہ زاد ماموں تھے جو مطبع نول کشور لکھنؤ کے کاتب تھے ابتداءً اپنا کلام اُن کو دکھایا۔ حضرت رشک کے سوا پھر کسی سے اصلاح نہ لی۔ واقعی وہ خود ایسے جوہر قابل تھے جن کو کسی کی اصلاح کی ضرورت نہ تھی۔ ابتداءً مین پوری میں چند روز عہدۂ نظارت پر کام کیا۔ پھر ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر کے آگرے میں وکالت شروع کی اُن کی قانونی لیاقت کو دیکھ کر حکام نے بغیر خواہش و استمزاج ان کو منصف مقرر کرنا چاہا بلکہ حکم بھی بھیج دیا مگر اپنی بڑھی ہوئی اور کامیاب وکالت اور آزادیٔ طبیعت اور لطف صحبت احباب کے سامنے انہوں نے وہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے عالمگیر ہنگامے کے سبب سے آگرہ چھوڑنا پڑا۔ اور اس شورش کے فرو ہونے پر مین پوری آئے اور آخر عمر تک یہیں وکالت کرتے رہے یہاں تک کہ ۲۴ اپریل

کو بروز دوشنبہ وفات پائی۔ مولوی محسن میانہ قد، گندمی رنگ، کے آدمی تھے۔ چہرے پر چند داغ چیچک کے بھی تھے۔ داڑھی بیشتر خشخشی رکھتے تھے اور خضاب لگاتے تھے۔ آخر عمر میں داڑھی بڑھائی تھی اور خضاب چھوڑ دیا تھا۔ انتقال سے ۲۵ سال پیشتر کسی دوا نے حلقوم کو خشک کر دیا تھا جس سے آواز بیٹھ گئی تھی۔ اور بہت باریک آواز سے بولتے تھے مگر ایسا بولتے تھے کہ سب کلاء و حکام اُن کی گویائی کا لوہا مانتے تھے۔ اُن کے تقوی و زہد نے اُن کی شاعری کو گل و بلبل کا افسانہ اور مجازی حسن و عشق کا کاشانہ بننے دیا۔ اگرچہ چند شماری اشعار عاشقانہ شاعری کے ذیل میں اُن کے کلام کا مجموعہ پیش کرتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ اُن کی تفریحی منظوم ہے۔ دراصل وہ نعتیہ شاعر تھے اور اس فن لطیف کو اگر کسی نے لفظاً و معنیً فن شریف بنایا ہے تو وہ تنہا محسن کاکوروی کی ذات تھی۔ اُن کی نعت گوئی تشبیہہ و استعارات۔ مبالغہ و اغراق۔ تلازمات و مراعاۃ النظیر سب کچھ موجود ہے اور بحد کمال موجود ہے مگر پڑھنے والا اس کو پڑھکر جھوم جاتا ہے اور اُنکی معنی آفرینی اور سخن گستری کو دیکھ کر بے ساختہ داد دینے لگتا ہے۔ اس کلام پاک کو پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا مداح فی الحقیقۃ عاشق صادق ہے۔ اہل ہوس میں نہیں۔ اُن کا قصیدہ لامیہ جو دوسروں کے ہم طرح قصائد کے ساتھ اس انتخاب میں شامل ہے۔ مشہور و معروف اور اپنے رنگ میں بے مثال قصیدہ ہے جس سے اُن کی پر زور طبیعت اور رسائی فکر کی قوت و بلندی معلوم ہوتی ہے مولانا محسن

کے قصائد دو چار سے زیادہ نہیں مگر جتنے بھی ہیں اُن کا ایک ایک لفظ درود
پڑھنے کے قابل ہے اور ہر شعر مذاق شاعری میں ڈوبا ہوا ہے۔

۱۴۔ تسلیم۔ احمد حسین نام تھا، مگر امیر اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ تسلیم تخلص اور مولوی عبدالصمد انصاری کے بیٹے تھے۔ نواح فیض آباد میں منگلیسی ایک گاؤں تھا۔ وہاں ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے اُن کے والد پلٹن میں تھے اس تقریب سے لکھنؤ میں نشو و نما پائی۔ باپ اور بڑے بھائی مولوی عبداللطیف سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں اور خطاطی میں کمال پیدا کیا۔ شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی۔ لکھنؤ میں ایسے لوگوں کی صحبت میسر آئی جو شعر و سخن کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ اس سے وہ رنگ چمک گیا۔ جب مرزا اصغر علی خاں نسیم لکھنؤ آگئے تو اس میں برگ و بار پیدا ہو گئے۔ اُن سے مشق سخن کرنے کے بعد اپنی راہ اہل لکھنؤ سے الگ نکالی۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے زمانے میں اپنے باپ کی ضعیف العمری کے سبب اُن کی جگہ ملازمت کر لی اور مشق سخن بھی جاری رکھی۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں جب وہ پلٹن توڑ دی گئی تو یہ بیکار ہو گئے، مگر شاعری سے دل شکستہ نہیں ہوئے تھے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر دربار شاہی میں پیش کی۔ وقت آگیا تھا۔ بادشاہ کی نظر اُس پر پڑ گئی اور نظم ہی میں یہ حکم لکھوایا:۔

بشنو اے خوشنویس و اے خوش گو ہر دو فن می کنی و ہر دو نکو

اسم تو مندرج بدفتر شد          بست و دو روپیہ مقرر شد

۱۸۵۷ء میں نوابی ختم ہوگئی تو چند ماہ پھر کسی پلٹن میں ملازم رہے۔ بالآخر
رام پور چلے گئے اور عرصے تک وہاں رہے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر لکھنؤ گئے
اور نواب محمد تقی خاں کے متوسل ہوکر مطبع نول کشور میں بھی کام کرتے رہے
پھر جب نواب کلب علی خاں والی رام پور مسند آرا ہوئے تو تسلیم بھی خلعت
ملازمت سے سرفراز ہوئے۔ غرض کہ اسی طرح رام پور، مانگرول کی ریاستوں
کے مداح و متوسل رہ کر خوش و ناخوش اپنی زندگی بسر کی۔ بالآخر ایک سو تین
برس کی عمر پاکر بمقام لکھنؤ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔ تسلیم نہایت پرگو اور
پختہ شاعر تھے۔ غزلیات کے چار پانچ دیوان اُن کی یادگار ہیں جن کا اکثر حصّہ
چھپ گیا ہے۔ مثنویاں بھی متعدد لکھی ہیں۔ قصائد بھی کافی تعداد میں کہے ہیں
چوں کہ اُن کی عمر کا زیادہ زمانہ عسیر الحالی اور پریشانی میں گزرا ہے اس لئے
اکثر امرا و والیان ملک کی شان میں قصائد لکھنے کا اُن کو موقع ملا ہے عام جوہر
ان کے کلام کا، پختگی کلام، رنگینی الفاظ، اور دل پزیری مضامین ہے۔ وہ سلسلۂ
شاعری میں خاندان مومن کے متوسل تھے۔ اس لئے اُن کے مجموعۂ کلام میں وہ
سب محاسن و خصوصیات موجود ہیں جو مومن اور نسیم کے کلاموں کا امتیازی
طرہ ہے۔ جن دو قصیدوں کے اشعار اس انتخاب میں درج کئے گئے ہیں اُن
کے پڑھنے سے ناظرین معلوم کرسکتے ہیں کہ تسلیم اپنی قابلیت فن کے لحاظ سے

اپنے معاصرین میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

**۱۵۔ حالؔی** ۔ الطاف حسین نام، حالؔی تخلص، باپ کا نام ایزد بخش۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے ۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ ننھیال سادات کے معزز گھرانے میں تھی۔ ۹ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم پانی پت ہی میں پوری کی۔ پھر سید جعفر علی ممنون دہلوی کے بھانجے سے فارسی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ ابھی درسیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی اور ہنوز ستّرہ برس کی عمر تھی کہ ان کی مرضی کے خلاف شادی کر دی گئی۔ جس کے بعد تحصیل علم کے شوق میں گھر چھوڑنا پڑا اور ۱۸۵۴ء میں دہلی چلے گئے۔ یہاں رہ کر مختلف اساتذہ سے تشنگی علم کو بجھایا اور صرف و نحو، منطق و عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ حاصل کی۔ بالآخر شادی ہو جانے کی وجہ سے فکر معاش نے مجبور کیا اور ۱۸۵۶ء میں ایک سرکاری ملازمت کر لی مگر غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے یہ صورت بھی شادی۔ بعد غدر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس اعظم جہانگیر آباد سے ملاقات ہوئی اور اُن کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا نواب صاحب ایک جید فاضل اور مشہور شاعر تھے اُن کی خدمات اور صحبت سے حالی کو بہت کچھ فائدہ پہنچا اور جب شعر و شاعری کا پرانا شوق از سر نو تازہ ہوا تو یہ اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیجنے لگے ان واقعات کے بعد وہ

قسمت آزمائی کے لئے لاہور گئے جو اس وقت دلّی سے نکلے ہوئے لوگوں کا ملجاء ماوا ہو رہا تھا۔ یہاں اُن کو گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ مل گئی جس میں اُن کو سررشتۂ تعلیم کی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنی پڑتی تھی۔ چوں کہ اس کام میں انگریزی ادب سے بالواسطہ واقفیت ہو گئی اور انگریزی خیالات اور طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا مشرقی شاعری اور انشا پردازی کی فضول باتوں کی وقعت اُن کے دل سے کم ہو گئی اور اسی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اُسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ وہاں کم و بیش چار برس رہ کر دلّی کے اینگلو عربک اسکول کے مدرس مقرر ہوئے۔ اسی دوران میں سرسید سے ملاقات ہو گئی اور اپنا مشہور و معروف مسدس ۱۸۷۹ء میں لکھا۔ اور اس کے بعد اُن کی قومی اور ملکی شاعری نے جو ترقی کی وہ محتاج تشریح نہیں۔ اس وقت ہندوستان میں جس جدید شاعری کا عام چرچا ہے اس کے موجد فی الحقیقت مولانا حالؔی ہیں۔ مولانا حالی پُرانے زمانے کے یار لوگوں میں تھے انھوں نے شاعری میں جو اصلاح کی ہے وہ اُن قواعد و ضوابط کی پابندیوں کو سامنے رکھکر کی ہے جنکی بنیاد متقدمین اور متوسطین ڈال گئے تھے۔ گویا جسم وہی ہے لباس میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ مولانا کی عام تصانیف و تالیف مشہور عالم ہیں اُن کی مختلف خدمات ادب کے صلے میں گورنمنٹ کی طرف سے ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا

۷۷ برس کی عمر میں ۱۲ر صفر ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا۔

غزلوں اور بے شمار نظموں کے علاوہ دو چار قصیدے بھی مولانا حالی نے کہے ہیں۔ اس انتخاب میں اُن کے دو قصیدے درج کئے گئے ہیں۔ ایک قصیدہ نعتیہ ابتدائی زمانے کا ہے جو سوداؔ کے قصیدے پر کہا گیا ہے اور دوسرا وہ سب سے آخر کا جو نظام آصف جاہ سادس کے جشن جوبلی چہل سالہ میں حیدر آباد جا کر پڑھا تھا۔ پہلے قصیدے میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو ایشیائی شعراء کا طرۂ امتیاز ہے۔

۱۶۔ اسمٰعیلؔ۔ مولوی محمد اسمٰعیل ۲۲ر نومبر ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ سولہ برس کی عمر میں سر رشتۂ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ کچھ دنوں کے بعد ترقی کر کے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوتے۔ پہلے سہارنپور میں پھر میرٹھ میں ایک عرصے تک اسی عہدے پر رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہوگئے۔ جہاں بارہ برس تک قیام کر کے ۱۸۹۹ء میں پنشن حاصل کی۔ پنشن کے بعد اپنے وطن مالوف (میرٹھ) واپس آئے اور یہیں بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی۔ ان کی علمی قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خان صاحب کا خطاب بھی گورنمنٹ سے عطا ہوا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۷ء میں اس دنیائے ناپائدار سے رحلت کی۔ مولوی اسمٰعیل کی شہرت اردو پرائمری ریڈروں کی بدولت اس قدر ہے کہ نام سے بچہ بچہ واقف ہے مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہ نثار ہونے کے علاوہ بڑے پختہ اور مشاق شاعر بھی تھے۔ اگرچہ

شاعری میں اُن کا کوئی تخلص نہیں لیکن ان کے مجموعہ کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصناف سخن کے تمام شعبوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ عاشقانہ۔ سیاسی۔ اخلاقی۔ سوشل اور نیچرل۔ غرض کہ ہر قسم کی نظمیں ان کی کہی ہوئی موجود ہیں۔ اُن کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی کچھ کچھ پایا جاتا ہے اور طباعی اور قادر الکلامی اُن کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ زبان کی سادگی اور صفائی ایسی دلچسپ ہے کہ اُن کی نظم شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ پیرایۂ بیان ایسا موثر ہے کہ اس کے پڑھنے سے صاحب ذوق کو خاص لطف حاصل ہوتا ہے چونکہ وہ پُرانے مکتب کے تعلیم یافتہ تھے اور زمانۂ حال کو بچشم خود غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے اُن کے کلام میں جدید دَور کی شاعری بھی قدیم طرز ادا سے وابستہ ہے اس زمانہ میں جو بے قیدی اور بے پروائی فن سخن سے برتی جاتی ہے۔ اس کا پتہ اُن کے کسی کلام میں نہیں ملتا۔ بچوں کے لئے اکثر چھوٹی چھوٹی نظمیں اُن کی ریڈروں میں بکثرت موجود ہیں مگر کوئی نظم ایسی نہیں جو پُرانی شاعری کے قواعد وضوابط کے اصول کو نظر انداز کرتے ہوئے ہو۔ اُن کے مجموعہ کلام میں دو چار قصیدے بھی ہیں۔ ایک طول طویل قصیدہ ہے جس میں اُنھوں نے نہایت جامعیت کے ساتھ دنیا کے مختلف پیشہ وروں اور دیگر شعبوں کی حالت دکھائی ہے۔ چونکہ وہ قصیدہ بہت بڑا تھا۔ اور اُس کے انتخاب سے پورا لطف حاصل نہ ہوتا اس لئے اس کا انتخاب مناسب نہیں سمجھا گیا۔ حکیم مومن خاں کے ایک قصیدے کی

طرح پر جو قصیدہ مولوی اسمٰعیل نے کہا ہے اُس کا تھوڑا سا انتخاب درج کر دیا گیا ہے جس کو پڑھ کر اُن کی قادر الکلامی اور طباعی کا اندازہ ناظرین کو بخوبی ہو جائیگا۔

۱۷۔ **احسنؔ مارہروی**۔ سید علی احسن نام۔ والد کا نام سید مجتبیٰ حسن۔ مارہرہ ضلع ایٹہ کے مشہور خاندان سیادت کے رکن تھے۔ ہندوستان میں اُن کے اسلاف بہ عہد سلطان التمش بلگرام ضلع ہردوئی میں متوطن رہے۔ عالمگیر کے عہد میں ایک بزرگ شاہ سید عبدالجلیل خلف اکبر میر عبدالواحد شاہدی بلگرامی قصبۂ مارہرہ میں آ گئے۔ اس وقت بلگرام کی ایک شاخ مارہرہ میں پھولنے پھلنے لگی سلطنت اورنگ زیب کے آخر میں سید شاہ برکت اللہ بلگرام سے اپنے جد امجد شاہ عبدالجلیل کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے آئے اور اسی زمانے میں بعض مریدین و معتقدین نے مجبور کیا اور مارہرہ میں سکونت پذیر ہو گئے اس وقت سے اس خاندان میں سلسلۂ طریقت بہ پابندی شریعت جاری ہوا۔ امراء معتقدین نے شاہ صاحب کے بعد ان کے مزار پر ایک گنبد تعمیر کرا کے ایک درگاہ قائم کر دی اور چند دیہات اس کے مصارف کے لئے وقف کر دیئے۔ وہ درگاہ اب تک قائم ہے۔ اور جائداد وقف کا بھی کم و بیش منافع ملتا ہے۔ احسنؔ اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور انتہائی جتنی تعلیم پائی سب اپنی خانقاہ کے مدرسہ میں پائی اور ابتدائے عمر سے شاعری کا ذوق رہا۔ اور خط و کتابت کے ذریعے سے نواب فصیح الملک مرزا داغؔ کے

شاگرد ہوئے پھر کچھ دنوں بعد حیدرآباد جاکر اُستاد کے پاس رہے۔ مرزا داغ کا دیوان، یادگار داغ اُستاد کی وفات کے بعد انھوں نے ہی چھپوایا ہے۔ خدمات ادب اُردو میں اپنے اوقات صرف کرتے رہے تھے۔ اور چند سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ ادب اُردو کے معلّم بھی تھے۔

۳۰ اگست ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء کو ۶۶ سال کی عمر میں پٹنہ میڈیکل کالج میں اس دنیائے ناپائدار سے رحلت فرمائی۔ آپ کی لاش مارہرہ پہونچائی گئی اور وہاں کے قدیم قبرستان میں آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ کلیات دلی۔ منتخب داغ اور نمونۂ منثورات (تاریخ نثر اُردو) آپ کی زندہ رہنے والی تصانیف ہیں۔ یادگار داغ اور فصیح اللغات کی ترتیب بھی آپ ہی کے زیر اہتمام ہوئی۔ ان کتابوں کے علاوہ اور بھی متعدد علمی یادگاریں آپ نے چھوڑی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# قصیدہ در حمد و نعت و منقبت و موعظت

## از ولی دکنی

ہے زباں پر تو اوّل اوّل
نام پاکِ خدائے عزّ و جل

لائق مدح ہنیں ہے اُس بن اَوُر
اس اُپر متفق ہیں اہلِ ملل

آسماں اور زمیں کے سب ساکن
یاد کرتے ہیں اُس کو ہر پل پل

شکر اس کا محیط اعظم ہے
وہ ہے سلطان بارگاہِ ازل

بعد حمد خدائے بے ہمتا
یاد کر نعت سیدِ مرسل

جس کی ہمت کی ہے ترازو میں
دو جہاں مثل دانۂ خردل

اُس کی محفل میں آ ہوا ہے کھڑا
صف آخر میں، جو ہیرا اوّل

گر ہو وہ آفتاب گرمِ عتاب
آسماں جائے مثل موم پگھل

کاملاں سے سنا ہے یہ نکتہ
عشق اس کا ہے ہادی اکمل

بعد اس آفتاب انور کے
چار ہیں اہل علم و اہل عمل

صاحب صدق و عدل و علم و حیا ‌ ‌ ‌ ایک سوں ایک اکمل و افضل
ختم خلفا کی کیا کہوں میں بات ‌ ‌ ‌ جس کے رتبے کا عرش پر ہے محل
جب ہوا وہ سوار دلدل پر ‌ ‌ ‌ فوج پر فوج دَل پہ مارا دَل
وہ ہے یکتائے دین کہ جن نے کیا ‌ ‌ ‌ لاکھ مشکل کو ایک پل میں حل
نام اس کا کہ جس کے تقوے سے ‌ ‌ ‌ زور نے زور بل سے مارا بل
ہے علی وہ کہ جس کی دہشت سے ‌ ‌ ‌ جی گیا دشمنوں کا تن سے نکل
ہیں یہ چاروں ستون شرع متین ‌ ‌ ‌ دین کا اُن سے ہے مستقیم محل
مشرق و مغرب و جنوب و شمال ‌ ‌ ‌ سب کو ان چار ذات سے ہے بل
ہیں یہ اسلام کے صحیفے پر ‌ ‌ ‌ چار اطراف صورت جدول
بعد ان کے ہیں دو امام جہاں ‌ ‌ ‌ نور چشم پیمبر مرسل
ہر دو سلطان کشور کونین ‌ ‌ ‌ ہر دو مقبول شاہ روز ازل
ایک تن ہوا اطلس سبز ‌ ‌ ‌ ایک خوں سے زمین کیا مخمل
گل دنیا کو زیب تاج نہ کر ‌ ‌ ‌ یہ ہے سر پا تلک حیل و دغل
اس ہرگز نہ باندھ جی اپنا ‌ ‌ ‌ کہ مبادا ہو دین بیچ خلل
ایک گھر میں رہے نہ بخلی یہ ‌ ‌ ‌ طالب یار تو ہے یہ چنچل
یہ ہے پالغز طامعان حریص ‌ ‌ ‌ اکثر اس دیکھ کر گئے ہیں پھسل
ترک کر سب کو بات میری سُن ‌ ‌ ‌ حرف شیریں ہے زشیر و عسل

مرتبہ جو عشق بازوں کا یہ ہیں ملکِ وفا کے اہلِ دول
اے وؔلی یہ قصیدۂ رنگین جگ میں رکھتا نہیں نظیر و بدل
گوشِ حاسد میں جب پڑے یہ شعر راکھ ہو جائے رشک سے جل جل

---

## قصیدہ در منقبت

### از میر تقی میرؔ

جب سے خورشید ہوا ہے افسر دِ زحل
رنگِ گل جھمکے ہے ہر پات ہری کے اوجھل
وقت وہ ہے کہ زبس شوق سے چشمِ بلبل
خوبیِ دلکشِ گل دیکھنے کو ہوا حول
جوشِ گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر
لالہ و نرگس و گل سے ہیں بھرے دشت و جبل
لطفِ روئیدگی مت پوچھ کہیں شبہے میں ہو
سبزہ غلطاں ہے لبِ جو پہ کہ خواب مخمل
چشم رکھتا ہے تو چل فیض ہوا کو ٹک دیکھ
نرگس اُگتی ہے جہاں بوئی تھی دہقاں نے بصل

سیر کر تازگی و خرمی و شادابی
خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کونپل
خون خمیازہ کش عاشق و پنجۂ گل
دونوں نکلے ہیں تہ خاک سے اب دست و بغل
برگ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو
آگ کی گر کہیں سلگا کے رکھیں ہیں منقل
بیت بحثی کے تئیں مرغ چمن آئے ہزار
کسی گلبن کے تلے آپ بھی اب پڑھئے غزل

مطلع

نکلے ہے لالہ زبس چاک کر اب سینۂ تل
آتش گل سے جلا کرتا ہے سارا جنگل
تیرگی اپنے ستارے کی ہے سب پر روشن
آفتاب آتا ہے یاں دن کو جلا کر مشعل
غنچۂ خام کو جوں پھونک کے کھولے ہے طفل
یوں بھی کر دیکھا یہ دل عقدہ ہے مالا ینحل
وہیں کھینچے ہے یہ نقش بر آب اے منعم
کیسی محبوب گئیں صورتیں اس خاک میں رل

جنسِ دل مفت ہے سینے میں عجب کیا ہے جو لے
غمزے وے دزد ہیں آنکھوں سے چرالیں کاجل
شیخ کے قد کی درازی کے تئیں خال میں دیکھ
یاد آتا ہے جوانوں کے تئیں رقصِ جمل
کو دنے کو جو اٹھا سر پہ اٹھالی مجلس
دیکھئے بیٹھے جو پھر اونٹ تو بیٹھے کس کل
کیا میں اندھیر فلک کے کہ نہیں ملتی ہے داد
روز خورشید نکلتا ہے جلا کر مشعل
جو ہے سو دست بدل خاک بسر ہے اس سے
میں بھی نکلوں ہوں سدا منہ پہ کف خاک کو مل
دردسری ہے جو موجود ہے ذرہ اسکے میں
صبح نکلے ہے سدا ماتھے کو مل کر صندل
وقت ہے اپنے نفیری کی مدد کا یا شاہ
روز و شب رہتی ہے اس سوزی ہی سی جنگ و جدل

## مطلع

اے کہ اک تو ہی ہوا عالمِ اسرارِ ازل
لے کہ سو جان سے عاشق ہے ترا حسنِ عمل

تیری وہ ذات مقدس ہے کہ لیتے ہوئے نام
منہ سے ناخواستہ بھی صلّ علیٰ جائے نکل
مرحبا شاہی تری صلّ علےٰ جاہ ترا
کیا ہوا تخت ترا دوشِ نبی مرسل
فرش ہوتا ترے زائر کا سعادت تھی ڈلے
کیا کرے چادرِ مہتاب کہ تھی مستعمل
لقمۂ ظلم نہیں بچتا عدالت میں تری
بازنگلی ہوئی چڑیا کے دے ہے اُگل
تب ہوا دین محمدؐ کا بزورِ شمشیر
تو نے برہم کئے جب کتنے ہی ادیان و ملل
درہمی آگئی یک بار صفِ اعدا میں
ایک دو ہاتھ کے چلنے میں پڑی یہ ہلچل
تیرگی بخشِ جہاں بسکہ ہوا سرمۂ گرد
چشمِ خورشیدِ فلک تھی مثالِ مکحل
برہمی کا رگِ رزم کی مت پوچھ کہ تھا
کوہ پر کوہ فلک پر تھی زمیں دل پر دل

کیا لکھوں اسپ فلک سیر کے اُسکی تعریف
ادہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اُچھل
ایک مصور نے اُسے دیکھ کے دوڑایا خیال
دیکھوں اس باد کی مجھ سے بھی سکے شکل نکل
سر و سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ
اُڑ گیا صفحۂ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل
صاف کر زنگ دلِ میرؔ کہ احباب میں ہے
واسطے تیرے مخالف کے ہیں تیغیں صیقل

---

## قصیدۂ سوداؔ در منقبت

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک — دیکھ باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جلّ
قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی — پوششِ چھینٹ قلمکار بہر تحت و جبل
عکسِ گلبن سے زمیں پر ہے کہ جس کے آگے — کارِ نقاشیٔ مانی ہے دمِ دہ اوّل

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار سے آب رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹنے ہے سبزہ پہ ازبسکہ ہوا ہے بیکل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوزمیں کی بھی جو پھوٹے کونپل

دم عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعویٰ خدائی نہ کریں لات و ہبل

حد ایام کے پیش از مدد نامیہ سے
بچۂ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل

سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار
جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل

دست و گل خوردہ شاخ و گلزار بہم
بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل

غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ
گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل

آوے ہے اُن کے نظر لاکھ طرح کا وہ پھول
اُن گلوں چھٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل

یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے بسماجت کرے سبزے سے بدل

چشم نرگس کی بصارت کی نربس ہے دلیلے
غنچۂ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکحل

اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشم سیارہ گلستاں ہیں جھپکتی نہیں پل

آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر ایک گل پہ
ساغر لعل میں جو کیجئے زمرد کو حل

فکر نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی دست ہوا سے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے ۔۔۔ گل کو دیکھو تو نگہ جا رہے سنبل پہ پھسل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم ۔۔۔ پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہے کثرت لغزش بزمیں ہر باغ ۔۔۔ جو ثمر شاخ سے اُترا سو گرا سر کے بل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے ۔۔۔ شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل
دانہ جس شور زمیں پڑ ہ بھلا دہقاں سے ۔۔۔ سبزہ واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرتے ہیں ہر ایک تخم سے از فیض ہوا ۔۔۔ گرتے گرتے بزمیں برگ و برآتا ہے نکل
سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گرگٹ ۔۔۔ خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزند مغل
جوہری کو چمنستانِ جہاں میں اس فصل ۔۔۔ آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی ۔۔۔ اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل
نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے ۔۔۔ ہے فضا اس کی تو دو چار ہی دن میں فیصل
در میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام ۔۔۔ رہے گا سبز بہر مجمع و ہر ایک دنگل
تا ابد طرز سخن کی ہے مری رنگینی ۔۔۔ جلوۂ رنگ چمن جائیگا اک آن میں ڈھل
نام تلخی نہیں مجھ نطق میں، جز شیرینی ۔۔۔ یک طرف تاک گلستاں میں ہے یکسو حنظل
ہیں برومند سخنور مرے ہر مصرع سے ۔۔۔ مصرعۂ سرو سے پایا کسی نے بھی پھل
ہیں جہاں کے شعرا کام مرے آگے سرسبز ۔۔۔ نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل
ہے مجھے فیض سخن اس کے ہی مداحی کا ۔۔۔ ذات پر جس کی ہیں مبرہن کنہ عزّ و جل
مہر ہے جس کے منوّر ہے دل جوں خورشید ۔۔۔ رو سیہ کینے سے جس کے ہے یہ مانند زحل

بعض جس کا کرے جوں مور سلیماں کو ضعیف — مور کو جب سے ملے جس کے بلوں کا سائل
جائے وصلت پہ بنے جس کو ندے غیر از عرش — فرش گلزار زمیں حق نے سمجھ مستعمل
شیر یزداں شیر مرداں علیؓ عالی قدر — وصی ختم رسل اور امام اوّل
خاک نعلین کی جس کی مدد طالع سے — پہنچے اس شخص کو جو شخص ہو اعمائے ازل
وہ نظر آئے اسے دہر کی بینائی سے — رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل
مدح غائب سے کھلے اس کے نہ مداح کا دل — رو برو مطلع ثانی سے یہ ہو عقدہ حل
دید تیری بہ دوئی حق سے نگہ کا ہے خلل — ایک شے دو نظر آتی ہے بہ چشم احول

---

# قصیدہ بہاریہ سحر لکھنوی

اے ہوا جا کے بنارس سے اڑا لا بادل — چاہیئے ہندوی سوسن کے لئے گنگا جل
کام کرنے میں ہو بدلی کی اندھیری میں خلل — باغبانوں کو جو بجلی نہ دکھا دے مشعل
صحن گلزار ہے پھولوں سے معطر ایسا — شرم سے عطر میں ڈوبی ہے زمین صندل
قمریاں کہتی ہیں مستی میں جو چلتی ہے ہوا — ٹوٹ جائے نہ کہیں سرو چمن کی بوتل
اے فلک باغ میں دم بھر جو کبھی ابر نہ آئے — جوشش مے سے ہنیں یہ قبہ مینا بادل
باغ میں آکے نہالوں پہ جھکی ہے بدلی — بارہا ہزروں سے پی لیتے ہیں پانی بادل
مینہ برسنے میں جو دو دو نظر آتی ہے بہار — چشم نرگس یہ سمجھتی ہے کہ میں ہوں احول

دوسرے قطعہ کرے ابر بہاری فوراً — باغ میں پانی کی چادر ہو اگر مستعمل
روشیں صاف ہیں ایسی کہ پھسلتی ہے ہوا — پھول ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں سنبھل دیکھ سنبھل
آنکھیں نرگس کی بھی ہر وقت سکا کرتی ہیں — آتش گل سے اگر گرم ہے بلبل کا بغل
اب نہ آئے گی خزاں اور نہ جائیگی بہار — باغ کو گھیرے ہوئے چار طرف ہیں بادل
دم بدم رعد کی آواز چلی آتی ہے — شیشہ و جام سے خالی نہ رہے دست و بغل
آج تو خوب سی جی کھول کے پی لو یارو — فکر فردا نہ کرو دیکھ لیا جائے گا کل
وجد کرتے ہیں ملک ساز کی آوازوں پہ — دل زہرہ بھی یہ کہتا ہے کہ دو پاؤں تو چل
قہقہے رندوں کے تا عرش بریں جاتے ہیں — آگیا اب تو فرشتوں کی عبادت میں خلل
ہو گئی عابد و زاھد کو بھی تاثیر نشاط — کر دیا پائیں کی آواز نے دل کو بیکل
مدرسوں سے نکل آئے مدرس سارے — دوڑے حجروں سے وہ عمّال جو پڑھتے تھے عمل
مل گئے آن کے رندوں میں لگے پینے شراب — عقل جاتی رہی نشہ نے بنایا مختل
واہ کیا شعر ستحر میں کہ بقول عرفی — بلبل آمد بر بلبل بہ تمنائے غزل

## قطعہ

آب و تاب ایسی ہے سبزے میں ٹھہرتی نہیں آنکھ — نہر ہر اک نظر آتی ہے زمرد کی کھرل
عکس گلنار چمن پانی میں یوں ہیں جیسے — ورق سیمیں و طلا کیوڑے میں ہوتے ہیں حل
آن کر پیڑوں کے تھالوں میں نہاتے ہیں لال — سوکھتے سوکھتے ہو جاتے ہیں بالکل ہریل
اثر باد بہاری سے ہے ابر بہار — مینہ برستے میں اگر اوڑھ کے نکلو کمل

اس قدر شوق تماشائے چمن ہے سب کو — نیم رخ کھینچیے تصویر تو ہو مستقبل
صندلی رنگ ہوا میں جو چڑھائیں تیوری — بڑھے ہر چین جبیں صورت شاخ صندل
قوت نامیہ ایسی ہے کہ بڑھتے بڑھتے — کسی میں پھول لگیں پھوٹے کسی میں کونپل
کس قدر کیاریوں میں جمع ہیں گلہائے فرنگ — یہ بڑے دن کے لئے ہوتی ہے شاید کونسل
کیوں نہ دیوانے ہوں انسان ہوائے اس کی — دامن بادِ بہاری ہے پری کا آنچل
اب تو باتوں میں نکلتی ہیں ہزاروں شاخیں — باغبانوں میں جو ہوتی ہے کبھی ردّ و بدل

---

## قصیدہ منیر شکوہ آبادی در منقبت

پرتوِ مہر جو ہو شمع شبستانِ حمل — غازۂ صبح بنے قشقۂ ہندوئے زحل
نیم رخ پیکر جوزا مرِ شب سے ہو — دیدہ مہر نظر آنے لگے مستقبل
خسرو روز کرے مملکتِ شب میں جو دخل — ہند میں کیوں نہ کریں اہل فرنگ آ کے عمل
نور نورو زہوا ظلمتِ شب پر غالب — آ گیا اب کی مجوسوں کے عقیدہ میں خلل
چہرۂ روز ہوا غرفۂ شب سے پیدا — مہد یوسف نظر آنے لگی لیلیٰ کی بغل
پرتو روز ہوا مملکتِ شب میں محیط — کعبہ پہنے ہوئے ہے پیرہنِ صبح ازل
شب تیرہ کو جو آغوش میں لے پرتو روز — دل کافر نظر آنے لگے سیمیں مخمل
خود بخود نیم مسلماں ہوئے مشرک اس سال — دھو گئی نصف سیاہی طوا میرِ عمل

باغِ عالم میں اٹھا غلغلۂ شوکتِ روز
رات نے چھپنے کو ڈھونڈھی گُلِ شبو کی بغل

گُلِ رعنا کے تماشے کے لئے گلشن میں
ایک جا ہوگئیں شامِ ابد و صبحِ ازل

پردۂ ابرِ بہاری میں ہوئے گلشن
لے چلی دیدۂ نرگس سے چُرا کے کاجل

دینِ اسلام کو بھی نشو و نما ہے اس سال
اصل سے فرع ہوئی فرع سے پیدا کوپل

سنبلستاں میں نہیں لالۂ حمرا پھولا
کبھی بن میں نظر آتے ہیں سنہری بادل

رات بس کر نہیں آتی ہے زمانے میں صبح
سیرِ امروز کی خاطر جو ہے فردا بیکل

لالہ و گل نظر آتے ہیں بسانِ مرّیخ
سال بھر اب کی ہے دنیا میں برابر منگل

بنیۂ شیشہ کو بھی نشو و نما ہے اس سال
سرو مینا تے مئے ناب ہے گویا سنبل

یوم آیندہ کے اجزا ہوئے مشتاقِ چمن
کیا عجب آج کی ساعت ہے گھڑوں میں بیکل

شہسوار آتے ہیں گلگشتِ چمن کو اکثر
باگ کی بو دھوں سے کس طرح نہ بوٹے کوپل

اب کی ہر مصحفِ گل جامعِ عباسی ہے
قہقہا باغ میں کر لیتے ہیں ہر مسئلہ حل

چشمِ نرگس میں جو سرمہ کی نہ دیکھی تحریر
لالہ نے لے کے چراغ آپ ہی پارا کاجل

خبریں اب تختۂ سوسن کی اڑاتی ہے ہوا
نیل کا لاٹھ نہ بگڑے کہیں اے عزّو جل

کوڑیالے کے کھلے پھول کہ تارے چھٹکے
صورتِ چرخ ثوابت ہے نظر میں جنگل

کہیں سنبل کی سیاہی کہیں سوسن کی بہار
کیا عروسانِ چمن کرتے ہیں مسّی کاجل

لالہ سرخ ہے صبحِ گلِ نسرین کی شفق
چاندنی آئینہ آبِ رواں کی صیقل

سبز ہے اخگرِ منقل جو بقول عرفی
آگ کو ڈھونڈھتے ہیں غول جلا کر مشعل

وصف گلہائے بہاری میں کہوں وہ مطلع
جس کے لفظوں کی نظارت سے جمے تخم امل

## مطلع

لالے کو ہاتھ لگا تختۂ سوسن میں محل
نیل کے حوض میں شنجرف کیا کس نے حل

سبکے تار و رے سے ہے رنگ نباتی پیدا
بسکہ بیمار ہرے ہیں صفت سبزۂ تل

حجلۂ گل میں ہے پوشیدہ مگر کوئی عروس
پنکھڑی بن کے نظر آتے ہیں باہر آنچل

صاف اس درجہ ہوا ہے کہ خضرؑ اور مسیحؑ
کہتے ہیں عمر رواں سے نہ پھسل دیکھ سنبھل

خوف آتا ہے یہ اس فصل کی جاں بخشی ہو
کہیں کعبہ کو نہ پھر دوڑ کے چلیں لات و ہبل

کوئی مرتا نہیں جانداروں میں کیا موسم ہے
راحت افزا ہے چمن سے سوتی ہے اجل

آم کے بور کی کثرت سے نہ نکلے باہر
بیٹھ جائے وہیں آواز جو بولے کوئل

سبزہ کی نشو و نما ہے جو کوئی دے تشبیہ
کیجئے قطع تو پھر وصل ہو جائے مخمل

مدد خس سے دیوار کی حاجت نہ رہی
سرو قد سایہ کھڑا ہونے لگا اپنے بغل

عارض گل میں نزاکت نے کیا ہے یہ اثر
ہے طمانچہ سے زیادہ اثر ضرب مثل

آگ کے بدلے ہیں آتشکدہ دل میں لالہ و گل
بلبلیں اب نظر آتی ہیں سمندر کے بدل

فصل گل میں یہ لطافت یہ صفا ہے اے شیخ
شکل غلماں ہو مجسم ہو اگر حسن عمل

میکدہ نکہت گلشن سے بسا ہے ایسا
بوئے گل نکلے اگر پھول[لہ] کی ٹوٹے بوتل

اس قدر جوش نمو ہے کہ بقول عرفی
مے نگنجد بصراحی و صراحی بہ بغل

---

لہ شراب

اثرِ آب و ہوا اب کی بڑھا ہے ایسا — چمن تازہ ہے ہر انجمن اہل دول
چاندنی میں قدحِ بادہ جو رکھدے کوئی — دم میں تالاب وہ بن جائے یہ خوشرنگ کنول
شیروں کے پنجے نہیں کھلتے ہجومِ گل سے — کہیں باقی نہیں صحرا میں جگہ جائے اوتگل
ملکِ عالم بالا بھی نہیں اُڑ سکتے — وہ صفا ہے کہ پھسلتی ہے ہوا پر تگل
دونوں جانب سے جو سنبل نے کیا ہے سایہ — حوروں کی مانگ سے ہے پُر روشِ باغ ازل
بجلی بادل سے چمکتی نہیں بالائے ہوا — تخت سے نیچے لٹکتا ہے پری کا آنچل
قندِ مصنوع سے زہرِ عداوت شیریں — باغباں میٹھی چھری سے جو تراشے حنظل
چمنِ لالۂ حمرا میں چٹکتا ہے گلاب — لال کرتی میں تو اعدا ہوئی چلتے ہیں فل
ندرتِ موسمِ گل سے میں تعجب میں تھا — ناگہاں آکے یہ رضواں نے کیا عقدہ حل
شرح یہ کی کہ ملا بادِ صبا کو اس سال — گلِ شمعِ لحدِ نورِ خداوند اجل
جلوۂ قدرتِ حق دستِ خدا شیرِ خدا — زوجِ خاتونِ جناں نفسِ نبیِ مرسل

## مطلع

مسندِ خاص تری عرشِ خداوند اجل — منبرِ پاک ترا دوشِ نبیِ مرسل
مُہرِ دستی میں ترے جوہرِ افعال نگیں — اونگلی اونگلی ہے تری خامۂ نقاشِ ازل
مدح خدام میں ہے معترفِ عجز منیر — ختم کرتا ہے قصیدے کو یہ محتاجِ ازل
انوری، عرفی و سودا مع خورشید و سحر — اثر لکھنوی اقبال امیرانِ اجل
محتشم بھی ہے سنائی بھی ہے وحشی بھی ہے — اور بھی اُن کے علاوہ کئی استادِ اکمل

اُن کے اس وزن و قوافی میں قصائد میں نظیم
مگر ان صاحبوں نے بھی نہیں کوتاہی کی
نوبت اس ہیچمداں کی ہوئی ان سب کے بعد
ان کو ان سب کے قصائد سے مقابل کریں
دورِ آخر مرے حصہ میں دیا ساقی نے
درد بھی اب نہیں باقی ہے بجز لائے شراب
بادۂ ساقیِ کوثر سے ہوا ہوں سرمست
دُرِ نایاب میں لایا صدف قدرت سے
التزام ایسے قواعد کے کئے ہیں میں نے
اُس زمانہ میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے
روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش
ننگ ہے ستر بدن فرش سے اک کہنہ حصیر
مال و سرمایہ و اسباب ہوا سب برباد
میری تصنیف سے تھے جتنے رسالے نایاب
اب ہے یہ عرض شہ عقدہ کشا سے میری
نام لائق نہ ملا بہر قصیدہ ہم کو
عرض کرتا ہے یہ تصنیف کی تاریخ منیر

فارسی والوں کو تو فخر ہے سب سے اوّل
ایک سے ایک ہے اس بات میں دلی اکمل
اب سنیں اہلِ سخن ملتمس عبدا قل
نہیں کمتر بھی اگر اُن سے نہ نکلے افضل
پی گیا اس مے ناب کی ساری بوتل
وہی اس سفل کو لے فکر ہو جس کی اسفل
صاف کہتا ہوں کچھ اس میں نہیں نقد و دخل
جنس میرے سترکا کی کہن و مستعمل
جن شرائط میں حریفوں سے یہ مشکل ہو عزل
کہ مصائب میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل
آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل
جان عزت کی تردد کی مصیبت ہر پل
یہ کتابوں کے تلف ہونے سے ہو کرب اجل
اُن کے گم ہونے سے ہے لذتِ ہستی میں خلل
کیجئے ناخن اعجاز سے عقدے مرے حل
ورنہ وُرِّ نجف کہتی ہے عقل اوّل
حکم الہام ہے یہ نظم لآلیِ ازل
۱۲ ھ ۷۴

# قصیدہ بہاریہ قدر بلگرامی

باغ پر آج گھٹا ٹوپ اٹھا ہے بادل　　خسرو باد بہاری کا کھچا دَل بادَل
ابر خیمہ ہے تو بوندیں ہیں طناب خیمہ　　چوب خیمہ ہے دھنک سبزہ ہے فرش مخمل
جھک پڑی کالی گھٹا دن ہوا برسات کی رات　　سب کو ہر پھر کے دکھاتی ہے یہ بجلی مشعل
باغ میں چار طرف آگ لگا دی گل نے　　سبز جھاڑوں میں گلستاں میں چھٹے لال کنول
شجر الاخضر نارًا کا تماشا دیکھا　　لن ترانی کی نہ لے قدرتِ صناع ازل
ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند　　دست صناع ازل میں ہے تجارت کی کل
کبھی چھایا ہے سفید ابر کبھی ابر سیاہ　　گہ فرنگی کا عمل ہے کبھی زنگی کا عمل
تحت د فوق ایسی بہاری نے لگائی ہے آگ　　ق　　کہ گل لالہ پر داغ سے تا اوجِ زحل
اب کے سال اٹھتے ہیں اس درجہ بخارات بیا　　کہ تمام ابر کا کالا ہوا اُجلا کمبل
آتشِ نالۂ طاؤس سے اٹھا جو دھواں　　ہو کے یکجا وہ بخارات گھر آیا بادل
یہ وہ اژدر ہیں کہ حیواں کو نگل جاتے ہیں　　ابھی اٹھیں جو گھٹائیں تو گرے بُرجِ حمل
درد سر اُس کو ہوا جس کے صدائے طاؤس　　برق نے ابر کے ماتھے پہ لگایا صندل
اک برس بعد ہم آغوش ہوئے ہیں دونوں　　ہے دمن برق وہاں ابر سیہ ہرا جانل
آگئی ابر میں پانی میں غضب کی پھسلن　　برق کا پانوں ہر ایک مرتبہ جاتا ہے پھسل
جا بجا لالہ و صد برگ میں یہ عکس فگن　　لال پیلے نظر آتے ہیں فلک پر بادل

کانٹے پتوں کی زبانوں میں پڑے ہیں شاید — لے چلے ابر جو بھر بھر کے پکھالیں جاگل
ق
وہ اُٹھیں کالی گھٹائیں کہ خدا خیر کرے — ان میں شیدی نظر آتا ہے مجھے ہر اک پل
بیچ میں پڑھ کے ہوا نے انھیں سنکایا ہے — ایک اُستاد ہے ڈالا ہے غضب کا بل چل
اینڈوا ہالۂ مہتاب بنا لاتا ہے — ڈنڈ پہ خاک چڑھا دیتی ہے آندھی اول
ورزشیں کرنے لگیں نہر چمن کی موجیں — اُن کو شمشاد کے طرے کے بڑھانے پر چل
بد دیا ہے چمنستان میں اکھاڑا کب سے — دونوں جانب سے وہ خم ٹھونکتے ہیں بادل
گل کے ہاتھ ہے بہاری کا پیالہ اس فصل — سرو کے سر ہے جوانانِ چمن کا ڈنگل
رعد چلا کے یہ ہر ایک سے کہہ جاتا ہے — ہاں خبردار خبردار سنبھل دیکھ سنبھل
قہقہہ مار کے گل کہتے ہیں سبحان اللہ — بارک اللہ ہے پتوں کی زباں پر ہر پل
یوں شرابور ہیں بارانِ بہاری سے سرو — جیسے جوگی کے شوالے میں چڑھے گنگا جل
ابر پر یوں نظر آتا ہے خمِ قوسِ قزح — جس طرح سینۂ معشوق پہ آڑی ہیکل

## مطلع

یوں اُڑے لئے جاتی ہیں ہوائیں بادل — جس طرح کا نور بھی لے کے چلیں گنگا جل
جھولے میں بادِ بہاری پہ جوانانِ چمن — شاخیں ملتی ہیں کہ شادی سے بجاتے ہیں بغل
گر پڑی ہے درختوں پہ صبا مستانہ — غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل
مسکراتا ہے کہ دم ہنسا پڑتا ہے — غنچہ و گل میں دم صبح سے ہوتی ہے چہل
کوئی گل پھولے گا شوشہ کوئی پیدا ہوگا — رات سے حاملۂ غنچہ بہت ہے بیکل

لہلہاتا ہے وہ سبزہ کہ ٹھہرتی نہیں آنکھ — مخمل سبز پہ جس طرح ہو خواب مخمل
زخم گل باغ میں یک لخت ہرے ہو جائیں — چمن تیغ ہوا سے جو چمن ہو مقتل
کیا یہ نوبادۂ گلشن ہیں زمرد کے درخت — ہری کونپل ہری شاخیں ہرے پتے ہرے پھل
کچھ نظر کام نہیں کرتی ہے ہریالی میں — پاس سے بھی نظر آتے نہیں طوطے [illegible]
کیا گرا خاک پہ یارب فلک مینائی — سبز دامن ہے جو چوٹی تلک ایک ایک جبل
ڈالیاں ہیں وہ طاؤس گھنے پتوں سے — ابھی طاؤس کی چوٹی ہو جو پھیلے کونپل
قاف سے اڑتی چلی آتی ہیں پریاں یعنی — وہ بخار اٹھے پہاڑوں سے وہ آئے بادل
یوں گھٹا ابر کے ٹکڑوں میں چھپا رہتا ہے — جیسے اکثر گھنے پتوں میں چھپے پکا پھل
قرص خورشید تہ ابر نظر آتا ہے — جیسے ندی میں بھنور یا کسی پانی پہ کنول

مطلع

قوت نامیہ ہے اٹھتی جوانی ہر پل — کہ جوانان چمن آج ہیں کچھ اور ہی کل
کیا عجب سرو پہ چڑھ کر جو لٹک جائے — کیا عجب گردش افلاک میں آ جائے خلل
کیا عجب لوگ ہتھیلی پہ جما لیں سرسوں — کیا عجب ہاتھ کے تل سے کوئی پھوٹے کونپل
کیا عجب رشتۂ زنار سے بیلیں پھیلیں — کیا عجب دانۂ سبحہ سے اُگے نخل امل
کیا عجب روح شہیداں بھی پئے دید بہار — خاک سے بیر بہوٹی کی طرح آئے نکل
کیا تعجب ہے کہ شیشے کی بھی پھوٹے جو زباں — باتیں کرنے لگے طوطے کی طرح ہر بوتل
قلبہ رانی نہیں کرتا در نہ یہ چلاتے ہیں — شاخ میں اگاؤ زمیں کے وہ لگا ہل کا پھل

صورتِ گلشنِ شدّاد نہ اُٹھ جائے کہیں
نامیہ سے بڑے زوروں پہ ہے سارا جنگل

گھانس سی گھانس ہے اللہ غنی فیض نمو
پھیلتے پھیلتے مالی ہوئے جاتے ہیں شل

شام تک خاک بھی چھل جاتی ہے ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت
صبح تک سبزہ اُبھر آتا ہے ڈیڑھ ڈیڑھ انگل

جو یوں ہی پھولتی پھلتی رہی گلشن میں بہار
جو یوں ہی نامیہ کرتا رہا ہر عقدہ حل

کیا تعجب ہے جو گور میں نکل آئے پھول
کیا تعجب ہے اگر سرو میں آجائے پھل

کیا تعجب ہے کہ پتھر میں نمو پیدا ہو
خاک سے چرخ کی جانب کو چلے بڑھ کا چل

وا ہیں نیلگری اُڑ کے ہو چرخ نیلی
اس قدر خاک سے اونچا ہو ہر اک کوہ و جبل

ہند والوں کو نظر آنے لگے ملک دکن
پر یہ ہے شرط کہ آنکھوں میں ہو کوئی خلل

کہکشاں ہے کہ نظر آتی ہے موسیٰ ندی
وہ ہے مولا کا پہاڑ اور یہ چرخ اوّل

کہ مسجد نظر آتی ہے کہ بیت المعمور
چار مینار ہیں یا عرش کی ساقوں کے پھل

حیدرآباد ہے اونچا فلک چارم سے
حبذا قدرت و صناعی صناع ازل

ہے وہ خورشید علم اس فلک چارم پر
جس کا ہر خاک پہ ہے دھوپ کے مانند عمل

مہر گستر فلک ملک کا شاہ خاور
ذرّہ پرور کرم و مہر میں اک ضرب مثل

شاہ محبوب علی بادشہ ملک دکن
خود اولی الامر جہاں ظلّ خدا عزّ و جل

اس قصیدے کا جو آئینۂ محبوب ہے نام
نذر دیدو یہی سرکار کو تم پہلے پہل

شعر گنتے ہوں جو منظور تو کیا مشکل ہے
حیدرآباد کے اعداد گنیں اہل جمل

# قصیدہ بہاریہ نعتیہ محسن کاکوروی

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل     برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل     جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی     کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی     ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانب قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ     کہیں پھر کعبہ پہ قبضہ نہ کریں لات و ہبل
دھر کا ترسا بچہ ہے برق لئے کاہین تک     ابر چوٹی کا برہمن ہے لئے آگ میں جل
ابر پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم     برق بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی     پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
دیکھئے ہوگا سری کشن کا کیوں کر درشن     سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلے     تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
اب کہ میلہ تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا     نہ بچا کوئی محافا نہ کوئی رتھ نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے     نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
تہ و بالا کئے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے     بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل
کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہ نو کی کشتی     بحر اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہل چل
قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاج عالی     لالۂ باغ سے ہندوئے فلک کھیم کسل

شب دیجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں
لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

شاہدِ فکر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ
چشم کافر ہیں لگائے ہوئے کافر کاجل

جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل

شب کو مہتاب نظر آئے نہ دن کو خورشید
ہے یہ اندھیر مچائے ہوئے تاثیر زحل

وہ دھواں دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع
گرچہ پروانہ بھی ڈھونڈھے اسے لیکر مشعل

نور کی پتلی ہوئی پردۂ ظلمت میں نہاں
چشم خورشید جہاں میں ہیں آثار سبل

آتشِ گل کا دھواں بامِ فلک تک پہنچا
جم گیا منزل خورشید کی چھت میں کاجل

ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیر اگپ ہے
برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

جس طرف سے گئی بجلی پھر ادھر آ نہ سکی
قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل

آج یہ نشو و نما کا ہے ستارہ ہے چمکا
شاخ میں کاہکشاں کی نکل آئی کونپل

دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے گلشن کی بہار
دیدۂ نرگس شہلا کو نہ سمجھو احول

خضر فرماتے ہیں سنبل سے تری عمر دراز
پھول سے کہتے ہیں پھلا آئے ہے گلزار امل

جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر
مصحفِ گل کے حواشی پہ طلائی جدول

جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

آہ قمری میں مزا اور مزے میں تاثیر
سرو میں دیکھئے پھول آنے لگے پھول میں پھل

شاخ میں پھول ہیں جنبش ہے زمیں پر سنبل
سب ہوا کرتے ہیں گلشن میں سوار و پیدل

شجرے میں پیر مغاں کے نکل آئیں شاخیں
حرمتِ دخترِ رز میں نظر آتا ہے خلل

سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخی لب — چمن حسن سے لال اُڑ گئے بن کر ہریل
صاف آمادۂ پرواز ہے شاماں کی طرح — پر لگائے ہوئے مژگاں صنم سے کاجل
دیکھتا گر کہیں محسن کی فغاں وزاری — نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

مطلع

پھر چلا خامہ قصیدے کی طرف بعد غزل — کہ ہے چکر میں سخن گو کا دماغ مختل
باغ میں ابر سیہ مست چڑھا کر آیا — جام و خورشید مع میکدۂ برج حمل
چشم میکش میں گلابی ہے کہ پھولا گلاب — پھول کیوڑے کا کھلا ہے کہ کھلی ہے بوتل
جام کے بادہ سے کہتے ہیں کہ رندوں کو نہ چھیڑ — دست بے جام سے کہتے ہیں کلیجوں کو نہ مل
گوہر دل کو بڑی سنگدلی سے پیسا — کشتی مے کو بنایا ہے مرے ساقی نے کھرل
کیسی افسردگی کیا بات ہے مرجھانے کی — غنچہ کہتا ہے کہ لجا لو سے کہ گلشن سے نکل
سیر دشت کی مصروف ہے جو مانوں ہے لنگ — شغل میں چاک گریباں کے ہے جو ہاتھ ہے شل
مصر والوں کو یہ ڈر ہے کہ زلیخا کے لئے — سر بازار نہ بکنے لگے سودے خلل
ہے سخن گو کو نہ افشا کی نہ املا کی خبر — ہو گئی نظم کی افشا و خبر سے مہمل
دل میں کچھ اور ہے پر منہ سے نکلتا ہے کچھ اور — لفظ بے معنی ہیں اور معنی ہیں بے لفظ اکل
کتنا بے قید ہوا کس قدر آوارہ پھرا — کوئی مندر نہ بچا اُس سے نہ کوئی استل
کبھی گنگا پہ بھٹکتا ہے کبھی جمنا پر — گھاٹ گھرا پر کبھی گذرا کبھی سوئے چمبل
پھینکے دینے سے نہ محفوظ ہے قلزم و نیل — نہ بچا خاک اُڑانے سے کوئی دشت و جبل

ہاں یہ سچ ہے کہ طبیعت نے اُڑایا جو غبار
ہوئی آئینۂ مضمون کی دوچنداں صیقل

رشتۂ معنی ہی بھٹکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف
تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل

اک ذرا دیکھئے کیفیت معراجِ سخن
ہاتھ میں جام زحل شیشۂ مہ زیر بغل

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں کھا پانوں
کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بل

یعنی اُس نور کے میداں میں پہنچا کہ جہاں
خرمنِ برق تجلی کا لقب ہے بادل

تار باران مسلسل ہے ملائک کا ورود
لب پہ تسبیح خداوند جہاں عزّ و جل

کہیں طوبیٰ کہیں کوثر کہیں فردوس بریں
کہیں بہتی ہوئی نہر لبن و نہر عسل

کہیں جبریل حکومت پہ کہیں اسرافیل
کہیں رضواں کہیں ساقی کوثر کا عمل

کنز مخفی کے کسی سمت نہاں تہ خانے
اک طرف مظہر قدرت کا عیاں شیش محل

عاشق جلوہ طلب گار کہیں چشم قبول
ناز معشوق کے پردے میں کہیں حسنِ عمل

گل بے رنگی مطلق سے مہکتے گلزار
بے نیازی کی ریاحین سے مہکتے جنگل

باغ تنزیہ میں سرسبز نہال تشبیہ
انبیا جس کی ہیں شاخیں عرفا ہیں کونپل

گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی
زیب داماں ادب طرۂ دستار ازل

نہ کوئی اُس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

اوجِ رفعت کا قمر نخل دو عالم کا ثمر
بحر وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول

مہر توحید کی ضو اوج شرف کا مہ نو
شمع ایجاد کی لو بزم رسالت کا کنول

مرجع روح امیں زیب دہ عرش بریں
حامی دین متیں ناسخ ادیان و ملل

ہفت اقلیم ولایت میں شہِ عالی جاہ　　چار اطراف ہدایت میں نبیِ مرسلؐ
جی میں آتا ہے لکھوں مطلع برجستہ اگر　　وجد میں آ کے قلم ہاتھ سے جائے نہ نکل

## مطلع

منتخب نسخۂ وحدت کا تھا یہ روزِ ازل　　کہ نہ احمدؐ کا ہے ثانی نہ احمدؐ کا اول
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل　　میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی　　نہ میرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے　　صرف تیرا ہو بھروسہ تری قوت ترا بل
صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح　　ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ　　سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

## قصیدہ بہاریہ امیر مینائیؒ

عالم خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل　　غنچہ طور کو جس باغ کی کہنے کو بغل
خواب میں سبزۂ خوابیدہ جو داں کا دیکھے　　خواب ہو طالع خوابیدہ خواب مخمل
سامنے اُس کے کسی اور چمن کا کیا ذکر　　گلشن خلد بھی مجھ کو نظر آیا جنگل
اک شگوفہ تھا اُسی باغ کا باغ عشرت　　ایک غنچہ اُسی گلزار کا گلزار امل
ساغر عشرت کونین وہیں کے دو پھول　　میوۂ مقصد دارین وہیں کے دو پھل
واہ رے نشو گل و لالہ اگر عکس پڑے　　خون لعل آئے رگ کوہ بدخشاں سے نکل

سخت حیراں ہو کہ دیوار کو دوں کس سے مثال
کہوں آئینہ تو آئینہ میں اتنا نہیں دل

دستِ مژگاں سے سنبھالے تھیں نگہ کو آنکھیں
پھر بھی دیوار پہ جب پڑتی تھی جاتی تھی پھسل

لالہ آتا تھا نظر یوں پسِ دیوار چمن
جس طرح شیش محل میں کوئی روشن مشعل

خطِ گلزار سے ہر گل پہ یہ مصرع تحریر
نقشِ ثانی ہے یہ فردوس ہے نقشِ اول

طوبیٰ و سدرہ کی آنکھیں پئے تسلیم ہیں خم
عرش تک فرش سے ہے بادِ بہاری کا عمل

ہے یہ تاثیرِ نمو ہاتھ جو محرم کے کٹیں
صورتِ دستِ حنا رآبنِ تیغ سر سے نکل

قوتِ نامیہ کا تھا یہ تعلی سے کلام
طارم پست ہے اس باغ میں چرخِ اول

سبزہ کاہکشاں غنچہ پروین کیسا
خوشۂ تاک رگِ تاک سے آیا ہے نکل

اور ثنا خوں کا تو ذکر یہ ہے فیضِ نمو
نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل

خواب میں دیکھے اگر ترکِ فلک یاں کی بہار
شب ہی کو گلشنِ انجم کو کرے مستاصل

کچھ بھی دکھلائے اگر بادِ بہاری نیرنگ
گل ہو گلدان میں انگارے درونِ منقل

ٹکڑے بدلی کے نہ تھے ہندوے سوس کے لئے
بھر کے آیا تھا وہاں چھاگلوں میں گنگا جل

نوجوانانِ چمن دھوپ کیا کھاتے
چتر کھولے ہوئے پھرتے تھے ہوا پر بادل

ہر روش سبزے پہ ڈال عکسِ گل لالہ نہ تھا
سیج تھی پھولوں کی بالائے بساطِ مخمل

مور تھے رقص میں مصروف برنگِ طاؤس
جھومتے پھرتے تھے مستوں کی طرح سے بادل

سینے تانے ہوئے پھرتے تھے چمن میں طاؤس
اس تمنا میں کہ لگ جائے گلے سے بادل

لڑکھڑاتا تھا جو مستی میں کہیں پائے نسیم
غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل

چمن دل میں، جو عارف کے چلی واں کی نسیم — گل صد برگ بنے غنچۂ اسرار ازل
سوئے بتخانہ جو پہنچی ہوائے جاں بخش — کلمۂ توحید کا پڑھنے لگے عزا و ہبل
کیا عجب دانۂ اسپند ہو جل کر پھر سبز — کہ دھواں اٹھتے ہی بنتا ہے ہوا پر بادل
طرفۃ العین میں وہ روشنی آ پہونچی قریب — نخل مومی کو بھی لے آتی تو لے آتا پھل
قوت نامیہ کے جوش سے آئینے میں — کیا عجب سبزہ زنگار سے گل آئے نکل
تخم تخم اُس کا شجر بن کے نیا پھل دیتا — ٹوٹ جاتا جو کہیں گر کے زمیں پر کوئی پھل
پانی دیتا صفتِ دامن تر وقت فشار — تھا یہ تر سایۂ دیوار چمن کا کمل
گرد گلزار کے ہوتا تھا تصدق خورشید — چاہتا تھا کہ کرے لالہ سے دستار بدل
نقش پاتا تھا صفت جام لبالب مے کے — رنگ پھولوں سے ٹپکتا تھا کہ آیا تھا اُبل
گل نسریں پہ تھا یوں عکس شعاع خورشید — جیسے سونے کو کرے سا غر الماس میں حل
غنچۂ لب کا کیا ذکر ہے گل ہے کھلتا — عقدۂ گیسوئے خوباں جو وہاں ہوتا حل
ایک دم بلبلِ سرمست جو ہوتی تھی خموش — جام منقار سے آتی تھی مے نغمہ بل
دل سے کُلفت کو مٹایا یہ صفائے گل نے — زنگ آئینے کا جس طرح مٹا دے صیقل
آگیا گل کی صفائی کا جو بلبل کو خیال — سر بھی بیضے سے نہ نکلا کہ گیا پانوں پھسل
آبدار ایسی تھیں نہریں کہ مقابل ہو اگر — آب میں چشمۂ خورشید کے آجائے خلل
نکہت گل سے ہر اک موج جو ابرِ رگ گل — پھتو گل سے حباب لب جو رنگ محل
شہد کی نہر رداں مثل جناں ہوتی تھی — پھول پر بیٹھ کے اُڑتی تھی جو زنبور عسل

ہو گیا لوٹ میں سامان یہ آیا جو نظر — پانوں کس طرح سنبھلتا کہ گیا دل ہی پھسل
لے اڑی ہوش مرے حیرتِ نظارۂ باغ — آگیا غش مجھے بیہوش گرا سر کے بل
متحیر تھا کہ یارب ہے یہ کیسا گلزار — غنچہ ہے تنگ دہن کس سے معما ہو یہ حل
گوشِ گل میں ہے ہوائے طرب انگیز بھری — کون سنتا ہے جو پوچھوں میں کہ کیا ہے یہ محل
قمریوں کو نہیں کوکو سے مجال گفتار — بلبلوں کو نہیں نغموں سے کسی شاخ پہ کل
تھا اسی فکر میں دریائے تحیر میں غرق — کہ رہا تھا کہ زہے صنعتِ صناعِ ازل
ناگہاں طرفِ چمن میں نظر آیا اک نور — آنکھ نے دل سے کہا دیکھ کے اس کو کہ سنبھل
طرفۃ العین میں وہ روشنی آپہنچی قریب — کھل گیا دیکھتے ہی اسکو مرے دل کا کنول
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے بیچ میں اک حور لقا — کچھ حسیں گرد ہیں آگے ہے فروزاں مشعل
گل کھلا فیض طراوت سے ہوا کے تازہ — پھول سوسن کا کھلا اٹھتی ہے دود مشعل
حور وہ حور جسے دیکھے تو فردوس سے حور — مضطرب نعرہ زناں خاک بسر آئے نکل
فرق سے تا بقدم پیکرِ انداز و ادا — غمزہ و ناز سے ڈالے دلِ عاشق کو کچل
گرمیِ حسن سے رخسار بھبھوکا ایسا — شمع کی طرح جسے دیکھ کے دل جائے پگھل
چال وہ چال کہ بھونچال ہو جس سے لرزاں — چرخ پر غل زمیں جس سے پڑے اک ہل چل
ہو زمانہ تہ و بالا جو وہ تند خرام — ہے یقیں جائے زمیں پانوں کے نیچے سے نکل
چھاگلوں کے یہی دو حاکم تھے وقتِ رفتار — زندے مر جائیں تڑپیں مردے صدا لہ اچھل
جو کرے آہوئے مشکیں کو ختن میں بھولے — بال کھولے جو حلب میں دکھائے چھل بل

قطرے کہتے نہ تھے پسینے کے رُخِ گلگوں پہ ہر … جوش کھا گرمیِ حسن آئی ہے چہرے پہ ابل
لبِ نازک پہ جمائی تھی بلا کی مستی … اور آنکھوں میں لگا یا تھا غضب کا کاجل
ہائے رے ناز لچکتی تھی نزاکت سے کمر … کچھ جو کاندھے سے دوپٹے کا ڈھلا تھا آنچل
پُتلیوں کا جو اُن آنکھوں کی تماشا دیکھا … دلِ ناداں مرے پہلو میں گیا اور مچل
تیر پہ تیر پڑے دل پہ نگاہیں جو لڑیں … نیم جاں پانوں پہ اُس کے گرا سر کے بل
اور کی عرض کہ اے عشوہ گہ غمزہ فروش … رحم کر رحم بس آگے دلِ مضطر کو نہ چھل
رُخِ روشن کی طرح آئینہ تو مجھ کو کیا … اپنے گیسو کی طرح کر مرے عقدوں کو بھی حل
کون سا باغ ہے یہ کون ہے تو میں ہوں کہاں … تجھ سے وحشت نہیں پاد رہے حیرت کا محل
متبسم ہوا پہلے تو وہ سرمایۂ ناز … پھر اک انداز سے بولا یہ دکھا کر کس بل
سر اُٹھا پانوں سے یہ بے ادبی خوب نہیں … اچھی صورت پہ گیا دیکھتے ہی خوب پھسل
ہوش میں یہ نہیں ہے قسم نباتات سے باغ … ہے سراپا چمن صنعتِ خلاقِ ازل

## قصیدہ سودا در مدح حکیم میر محمدؐ کاظم

علم ظنی ہے طبابت تو یہ سُن رکھ ہمدم … متفق اس پہ اطبا ہیں جہاں میں باہم
قاعدہ فنِ طبابت کا بیاں تجھ سے کروں … فہم کے گوش جو اپنے تو نہ رکھتا ہو صمم
کام اس فن میں رکھے سب سے ہے تشخیص مرض … یہ نہ ہو جس میں تو پھر سیف سمجھ اُس کی قلم
فی الحقیقت ہو اطبا میں وہی شخص طبیب … جو کہ ابیضی ان چیزوں کا ہو وے اعلم

جنبش نبض سے اور لوں سے قارورے کے — ہوئے فی الفور جسے اصل مرض مستفہم
اور یہ میں کرے تنقیح خواص مفرد — ہووے ترکیب مرکب کے وزن[1] سے محرم
سن بیمار پہ کر غور مداوا دہ کرے — اور ملحوظ رکھے آب و ہوا اور موسم
چار چیزوں سے مرکب بدن انسان کا ہے — دم و سودا ہے ہر ایک جسم میں صفرا بلغم
حد سے ان چاروں میں ہوئے متجاوز جو چیز — حکما کرتے ہیں انسان کا مزاج اس سے ضم
ہے یہ لازم کہ کسل[2] کا سبب اس میں ڈھونڈیں — ٹھہرے جو خلط کریں اس کا تدارک پیہم
بعد تشخیص دوا کیجے مرض کی بالضد — حفظ صحت کے لئے نسخہ ہو بالمثل رقم
غور اخلاط و کیفیت و کمیت پر — ہو نہ منظور جسے اس کی دوا ہوتی ہے سم
زیادتی چاروں میں جس کی ہو مرض کا موجب — عقل کے رو سے یہ تدبیر ہے اس کی اقدم
رکھ کے منظور طبیعت کے مرض پہ قوت — تنقیہ کر کے مناسب کریں اس خلط کو کم
قاعدہ یوں ہے پھر آگے ہے شفا اس کے ہاتھ — جس کے ہے قبضۂ قدرت میں علاج عالم
سو تو ان باتوں میں ہے خوض طبیبوں میں کسے — اس زمانے میں بجز میر محمد[3] کا نظم
خالق ان کے تئیں دنیا میں سلامت رکھے — ایسے انسان خلائق میں بہت ہوتے ہیں کم
شرف اس کو ہے سیادت سے نہ اس فن کا فخر — اس کا اک گوشہ نشینی میں ہے یہ فیض قلم
حق تعالیٰ نے دیا اپنے کرم سے اس کے — دست تدبیر میں دامان شفا مستحکم

---

[1-2-4] اس قسم کے الفاظ کا تلفظ عوام الناس کے موافق قدما لکھتے تھے۔۱۲

[3] اس طرح واو عطف کا اظہار بھی قدما کے کلام میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔۱۲

وصف میں اُس کی طبابت کے کسی شاعر کے — فکرِ عالی سے ہوا مطلع تازہ یہ رقم
نسخۂ میر نہیں نقش سے عالم کے کم — کہ مرض جن ہو تو اُس کا نہ کہیں ٹھہرے قدم
یہ عجب کیا ہے جو احیا وہ کرے موتی کو — نالے میں اُس کی قلم کے ہے مسیحا کا دم
چلتی ہے عہد میں اُس کے رہ ہر شہر و دیار — ہے جو مسدود جہاں میں تو وہ ہے راہِ عدم
عہد میں اُس کے ہے وہ خونِ کرم پر جس کے — ریزہ چیں ہند میں ہے لاکھ طرح کا عالم

اسم پاک اُس کا ہے نواب شجاع الدولہ
منبع جود و سخا یعنی وزیر اعظم

## قصیدہ انشاء اللہ خاں انشا

## در مدح نواب سعادت علی خاں

نظر آئی مجھے کل با ظفر و طوغ و علم — صورت فتح مجسم ہو بشکل آدم
سر پہ اک خود دھرے جس پہ بڑی سی کلغی — ڈھال کاندھے پہ پڑی ہاتھ میں شمشیر دو دم
زرۂ حضرت داؤد گلے میں اس کے — جبروت اُس کا فریدوں فر و جمشید شیم
خضر و الیاس جلو اُس کے ہیں جوں چاؤشاں — بھلے سے سطوت و فیروزی و اجلال و حشم
لمعۂ نور جبیں اُس کی سے طالع جوں مہر — سب رکاب اُس کی میں موجود صنادید عجم
اُس کے افواج کے گھوڑوں پہ کیا خوب چڑھیاں — تو وہ ٹھکانے پڑے پھرتے تھے مثل صیغم

دیکھو القصہ اُسے چونک گئیں یوں آنکھیں  دفعتہً چونک پڑیں جیسے غزالانِ حرم
بادب میں نے یہ معروض کیا اسم شریف  بارے فرمائیے اے مخزنِ الطاف و ہمم
تو یہ ارشاد ہوا تجھ کو نہیں کیا معلوم  نیرِ طالع فیروز ہیں اُس شخص کے ہم
وہ سعادت علی عالی اعلیٰ جو ہے  معدنِ جود و سخا لجۂ احسان و کرم
آج صد شکر خدا اُس نے کیا جشنِ جلوس  جس کی توصیف کی انشا میں قلم ہے اَبکم
یعنی نواب فلک رتبہ یمین الدّولہ  ناظم الملک بہادر وہ وزیر اعظم
الغرض تہنیتِ جشن جلوس اُس کا سُن  سید انشا نے کیا تازہ قصیدہ وہ رقم
ہو چکے ارشاد تو اب مطلع ثانی وہ پڑھے  تھرتھرا اٹھے جسے سنتے ہی کاؤس اور جم

## مطلع

کیوں نہ بخشے تجھے پھر شاہِ ولایت پرچم  تو من اللہ موید ہے خدا ہی کی قسم
اے وزیر ابن وزیر ابن وزیر ابن وزیر  کانپتے تیری شجاعت [illegible] ضرغام اجم
تیری شمشیر کی برش کی ہو کس سے تعریف  گھاٹ پر جس کے رہا خون ہے اعدا کا جم
دیکھ کر کہتے ہیں سب اہلِ خراساں اُس کو  ایسی دیکھی نہ سُنی شاہ خراساں کی قسم
جی میں ہے اور بھی اک مطلع ثالث پڑھ کے  چھین لوں کالبد چرخ سے تاروں کی چلم

## مطلع

سامنے تیرے جو رستم بھی کبھی ٹھونکے خم  تو وہ ہاتھ اُس کا اُسی طور سے رہ جاوے جم
اب دعا مانگے ہے تیرے لئے انشاء اللہ  یارب آمین کہیں سُن اُس کو ملائک باہم

ناظم الملک بہادر بھی ہو اور دُنیا ہو — ہر تنے پھرتے رہیں جب تک کہ یہ چاروں ہم
صحت و طول و بقا و طرب و دولت و جشن — ذات سے تیری رہیں تا بقیامت توام
راجہ اندر کے اکھاڑے میں ہیں جو نیکا ناچ — زر و دولت پہ ہمیشہ رہے یوں ہی چھم چھم

# قصیدۂ ذوق

یہ قصیدہ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں کہا گیا ہے اور عالم شباب کا کلام ہے حسب بیان مولوی محمد حسین آزاد نظر ثانی سے محروم ہے۔ اور یہ اکبر شاہ مرحوم کے فرزند شہزادہ سلیم کی شادی میں کہا گیا۔

اُفق دل پہ مرے عیش و طرب دونوں بہم — آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر توام
ایک کا ایک سے وہ ربط سخن تھا گویا — دو لب یار ہیں یا حضرت عیسیٰ ہمدم
روش ناز پہ ہمدوش تھے یوں جیسے کبھی — لام الف لکھتا تھا اسلام کا یاقوت اقم
یا تھے دو مصرع مربوط بہم دست و بغل — تا کہ پیوند تھے دو نخل گلستان ارم
دونوں پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں — کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھے نہ جعد پُر خم
ایک معنی کے وہ لفظ مترادف تھے دو — ایک مضمون کے دو فقرے تھے مگر مستحکم
تھے جڑے دو در شہوار کہ ہرگز نہ ملیں — ابر نیساں سے گریں لاکھ اگر قطرۂ یم
ایسے تھے دونوں وہ یک دل کہ دو قالب یکجاں — یک زباں دونوں وہ اس طرح کہ جوں چاک قلم
آئے لپٹے ہوئے یوں عالم سرشاری میں — نالۂ زیر کے ہمراہ ہو جوں نالۂ بم

میں نے پوچھا جو سبب اُن کے بہم ہونے کا
تو یہ ہاتف نے کہا غیب سے ہو کر ملہم

آج اس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طوے
کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم

کون وہ ظلّ خدا شاہ محمّد اکبر
جس کے ہمت سے ہوں ریوزہ گرار بابِ ہِمم

شاہ کا پوچھ جو فرزند تو شہزادہ سلیم
ہو سلامت روی اُس کی بہ سلامت منضم

اس لئے عیش و طرب شمل قِران السعدین
متفق ہو کے پئے تہنیت آئے اس دم

یمن اُس عقد نے بخشا ہے جہاں کو ایسا
جو گرہ آج لگائیں سو ہے لگتی محکم

آج وہ دن ہے مبارک کہ ابھی لائے ثمر
دو درختوں کو جو پیوند لگائیں باہم

بزم عشرت کی طرف کرتا ہے جو نظارہ
پڑھتا یہ مطلع رنگیں ہے وہ ہو کر خورم

ہے اٹھا عیش کا طوفاں لبِ ہر ساحلِ یم
زمزمہ موج کا بربط سے ہوا ہے ہمدم

گنگری کا سا ہے لچھا بہ گلوے مینا
ہچکیاں قلقل مینا جو ہے لیتی پیہم

جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ سے حرام
وجد میں آئیں سنیں آج گر آ ہوے حرم

بیاہ کی شب وہ تجمل تھا کہ اللہ اللہ
کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم

سچ کہو کرتے ہو نظارہ جہاں کا جب سے
کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا تمہیں آنکھوں کی قسم

جی میں ہے توسن خامہ کی عناں پھیر کے میں
مدح اکبر شہ ثانی کروں پھر زیب رقم

جس کے باعث سے منور ہے چراغ خورشید
جس کی دولت سے ہے آراستہ بزم عالم

اُس کی دیں داری کے نقارے کی اللہ رے صدا
از عجم تا بہ عرب اور ز عرب تا بہ عجم

جس سے پوچھو کہ تو آگہ ہے؟ کہے گا بلے
آنتَ تعرف کہو جس سے وہ کہے گا کہ نعم

گلشن مدح میں تِرے تیر سے ترا ذوق لگا — خرمنِ گل کی جگہ تازہ مضامین کا اٹم
پر یہ سمجھا کہ ہے جز کرتا دلالت کل پر — کہہ کے اک شمۂ ترے وصف کا اے نیک شیم
یہ دعا کرتا ہے دل سے کہ مبارک ہو تجھے — شادیِ وصلت فرزند بصد جاہ و حشم
ہوں شبستاں میں تری دست و بغل عیش و طرب — گھر میں حاسد کے دل آشوب رہیں محنت و غم

## قصیدہ امیر مینائی

## در مدح نواب کلب علی خاں والی رام پور

تخت کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہ قلم — دائرے طبل کی صورت ہیں الف شکل علم
ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات — یہی لشکر ہے یہی فوج یہی خیل و خدم
ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم — وزرا مرتبۂ و دبدبۂ و جاہ و حشم
منتخب ہیں جو مضامین تو معانی ہیں لطیف — ہیں یہی گنج و خزانہ وہی دینار و درم
اہلِ دفتر نے ہے کی کھول کے بستوں کو نشست — گردنِ منشیِ گردوں ہوئی تسلیم کو خم
کبھی منصب کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں — شقے لکھتے گئے ہونے لگے فرمان رقم
وقت دربار ہوا جمع ہوئے مجرائی — عقل و فہم و خرد و ہوش و تدابیر و حکم
سامنے آنے لگے خیر طلب بہرِ سلام — مژدہ تھا جو ادب کا وہ پکارا پیہم
روبرو خسرو جم جاہ و فلک فر کے نگاہ — تا ابد سلطنت پشت و پناہ عالم
ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل — مسند حکم ہوئی مطلع انوار قدم

بر بر دستخط خاص کو لایا کاغذ
حکمت الدولہ جو تھا منشئ یاقوت رقم

عرضیاں گذریں خلائق کی برائے مطلب
اب ہوئے لعل فشاں کھل گئے ابواب کرم

بعد اخبار کے پرچوں کی جو نوبت آئی
نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اُس دم

کہ ملازم جو ہیں سرکار کے دو دانش و وہم
در دولت پہ ہے ہنگامہ لڑے ہیں باہم

بحث اک بات کی دونوں میں ٹھنی ہے ایسی
کہ بہم گتھ گئے ہیں صورت خطِ توام

حکم عالی یہ ہوا جلد کرو حاضر بزم
دیکھیں کیا کہتے ہیں خود دونوں ہیں کیوں ہو کے گم

حاضر بزم ہوئے وہ تو ہوا یہ ایسا
کیوں لڑے کیا سبب جنگ ہے آگاہ ہوں ہم

عرض دانش نے یہ کی روز ابد تک قائم
یہ حکومت یہ ایالت یہ شہامت یہ حشم

بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں
حکمرانان زمانہ روسائے عالم

ایک حاکم ہے فلک جاہ خردمند ذکی
صاحب علم و ہنر معدن اخلاق و کرم

نام ہے کلب علی خاں بہادر جم جاہ
جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصر و جم

علم میں حلم میں جود و کرم و ہمت میں
ہے وہ یکتائے زمانہ سر اقدس کی قسم

جس میں جو بات ہو کیوں کر اُسے کوئی نہ کہے
ہے یہ انصاف گزیں حق کو چھپانا ہے ستم

میرے کہنے کو ذرا وہم نے باور نہ کیا
بلکہ مارا رہ انکار میں اُس نے قدم

کہ کمالات کا حصر ایک میں ہے ناممکن
کارخانہ ہے خدا کا نہیں خالی عالم

میں یہ کہتا ہوں میں دعوے میں ہوں اپنے صادق
ہیں دلائل جو ہوں گوش شنوا گوشِ اصم

علم میں حلم میں الطاف میں دانائی میں
ایک ہی فرد ہے یکتا ہے وہ فخر عالم

ہر سحر مشغلہ فریاد رسی داد رسی ‏ مہماں سینکڑوں ہر شام سرِ خوانِ کرم
جتنے جس شہر سے آتے ہیں مسافر مہماں ‏ کیمیا کرتی ہے اُن کو نظرِ فیضِ شمیم
مدح ممدوح بہت تجھ سے ہے دشوار امیر ‏ آتشیں ہے یہ وہ سخت تو چو میا ہے قلم
روک لے روک سنے رہو، طبیعت کی عناں ‏ کر دعا حق سے کہ اے خالقِ انوار ظلم

نورِ اقبال رہے اس کی جبیں سے طالع
ظلمت بخت سیہ حصۂ اعدائے دژم

# قصیدہ داغ
## در مدح نواب میر محبوب علیؒ خاں آصف جاہ نظام دکن

کیا جو اس بخت دجواں سال ہوا ہے عالم ‏ فلکِ پیر بھی کھاتا ہے جوانی کی قسم
ہو گئی فصلِ بہاری میں بھی اب کی برسات ‏ جوش سے ابرِ بہاراں کے ہوا یہ عالم
چرخ پر چھائی ہیں اس طرح گھٹائیں کالی ‏ جس طرح ہو رُخِ معشوق پہ زلفیں برہم
ہے سیہ ابر میں یہ روپ پہ بگلوں کی بہار ‏ انجم کاہکشاں کی لڑی جیسے ہو بہم
گرد افلاس کو بھی ابرِ کرم دھوتا ہے ‏ تارِ بارش میں موتی کی لڑی کا عالم
جوشِ پر رحمتِ باری ہے تعجب کیا ہے ‏ چاہِ بابل کا دھواں بھی جو بنے ابرِ کرم
کہیں بادل کی گرج ہے کہیں بجلی کی کڑک ‏ کہیں بوندوں کی پھواریں کہیں برسے جھم جھم
نعرۂ مست کا بادل کی گرج میں انداز ‏ نگہ شوق کا بجلی کی تڑپ میں عالم

ابرنیساں سے ہوئی ایسی تری خشکی میں
گائیں دیپک تو اُٹھے شعلے کی جا موجۂ یم

آب شمشیر میں جوہر ہے بشکل ماہی
آب آئینہ میں غواص ہے عکس آدم

پسلیاں اب نہیں دریا کی دکھائی دیتیں
خوب تن تن کے رواں ہونے لگے موجۂ یم

کشتیوں میں کہیں جلسے ہیں چڑھے دریا کے
ہو رہی ہیں کہیں تیراکوں میں شرطیں باہم

قوت نامیہ ایسی ہے تو کچھ دور نہیں
دوڑیں اُٹھ اُٹھ کے زمیں پر سے اگر نقش قدم

خاک میں جان ہے ایسی کہ نہیں اس کا عجب
زندہ ہو جائیں اگر زیر زمیں اہلِ عدم

نار دوزخ بھی بنے آج گلستانِ خلیل
اخگر سوختہ بھی ہوں گلِ گلزار ارم

بات کی شاخ میں بھی آج وہ ہے استحکام
توڑنا چاہیں تو ٹوٹیں نہ کبھی قول و قسم

اثر باد بہاری سے تعجب کیا ہے
گل فشاں صورت گلزار ہو نخل ماتم

ارض کو فوق سما ہے اسی موسم میں
کہ زمیں لوح زمرد ہے فلک ہے نیلم

وقت انشا اثر تازگی مضمون سے ہے
شاخ سرسبز بنے ہاتھ میں کاتب کے قلم

خط گلزار ہو قرطاس پہ کھینچیں جو لکیر
ہو برنگ رگِ گل ریشۂ سوراخ قلم

ہے وہ بالیدگی سبزہ سر راہ گذر
زور سے جس کے اُکھڑ جاتے ہیں ہر اک کے قدم

نکہت گل کا اثر ہو نفس مطرب میں
گائیں اس فصل میں گر رام کلی اہلِ نغم

روز ہر باغ میں گلبدنوں کے جلسے
چندریاں ساڑیاں سرخ اس پہ ترنج اکرم

یہ ہے موجودہ معدوم یہ تازہ وہ کہن
باغ محبوب کہاں اور کہاں باغ ارم

سبع سیارہ کو بھی یہ شرف حاصل ہے
معتدل آج کے دن چار دو عناصر ہیں بہم

نہ ہے گرمی نہ کہیں حد سے زیادہ سردی　　حیدرآباد میں ہے فصل کا ایسا عالم
روزِ نوروز ہے وہ فرخ و مسعود و سعید　　کہ زحل کی بھی سعادت نہیں برجیس کم
جشن نوروز ہے دربارِ شہِ والا ہے　　اہلِ دربار ہزاروں ہیں بیاں کم سے کم
شاہ کے نام سے ہوتی ہے محبت پیدا　　کیوں نہ محبوب دلِ خلق ہو اسمِ اعظم
خسروِ نامور و بادشہِ نام آور　　شادی میں جس کے کیا داغ نے مطلع یہ رقم
صاحبِ طبل و علم مالکِ شمشیر و قلم　　میر محبوب علی خاں شہِ فرخندہ شیم

کوکبِ ملکِ دکن ماہِ منیرِ دولت
مہرِ اقبال و حشم چشم و چراغِ عالم

# قصیدہ سوداؔ در منقبت حضرت امام حسینؓ

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منتِ دستار　　کہ سر نوشت لکھی ہے مری غبار
چمن زمانے کا شبنم سے بھی رہے محروم　　اگر نہ روشے مرے روزگار پر شبِ تار
عجب نہیں ہے کہ جاتی رہی ہو دنیا سے　　زبس خوشی نے مرے دل سے اب کیا ہے کنار
زبسکہ دل ہے مکدر مرا زمانے سے　　بجائے اشک میں آنکھوں سے پونچھتا ہوں نگار
کہاں فلک وہ کرے روزگار کا شکوہ　　کہ جس کے بخت کی سوگند کھائے ہے ادبار
دلا تو اپنے غم دل کو اب غنیمت جان　　بدل خوشی سے اسے ذرہ بھی نہ کر زنہار
جو گوش ہوش تو رکھتا ہے تو برابر ہے　　صدائے نغمۂ داؤد و نالۂ دلِ زار

شب گزشتہ نیرٹ درد سے میں تھا بیتاب  گزر گیا چمن فکر کی طرف ناچار
سنی میں اب غزل بلبل طبیعت سے  کہ بخت دل گرے آنکھوں سے اب ہزار ہزار
نہ پوچھ مجھ سے کدھر ہے خزاں کہاں ہے بہار  کہ بلبل قفسی کو ہے گل سے کیا سروکار
عجب نہیں کہ باد سموم ہو جاوے  نسیم گر گرے یکدم مرے چمن میں گزار
کہاں بہار کہاں ساقی اور کہاں ہے شراب  کہاں مغنی و مطرب کدھر ہے ناخن و تار
شکستگی سے مجھے دل کی یوں ہوا معلوم  فلک نے گوشۂ خاطر کو بھی کیا مسمار
پڑا پھرے ہے اسی فکر میں سدا ظالم  کسو طرح سے کسو دل کو دیجئے آزاد
رکھے ہے مجھ سے خصوصاً عداوت قلبی  خیالِ خام کو یوں ٹھے کے اپنے دل میں قرار
کہ خاک کر کے اُسے ہند میں بنا دوں گا  چراغ بت کدہ دختِ خانۂ خمار
کدھر خیال کو اب لے گیا ہے یہ سب بے مغز  زبس بھرا ہے سر اُس کا ہوا ہی کج رفتار
دکھاؤں گا اُسے اب مرد یوں کریں ہیں غم  مشیتِ ازلی بھی جو ہو شے ہم سے برآر
تو رو سیاہ کر اُس ہند کا کوئی دن میں  اُسی دیار کی گلیوں کا ہو جئے گا غبار
جہاں کی خاک کو سمجھے یہ شرف عجب کیا ہے  کہ فخر عرش ہے گر ہو شے اُس کے قرب جوار
جہاں کی مرگ کو کہتا ہے خضر عمر ابد  خدا نصیب کرے مجکو زندگی یکبار
جو کچھ کہ مجھ سے صدق سے تو باور کر  محمدی سے فرنگی ہو جو کرے انکار
ہے اس قدر وہ زمیں نور ہی سے مالامال  کہ جسکی رات کے آگے نہیں ہے دن کو قرار
غرض میں کیا کہوں یارو چمن میں قدرت کے  عجب ہے لطف کی اس قطعۂ زمیں پہ بہار

رہیں فلک پہ مہ و مہر جب تلک قائم — ہمیشہ دیکھے اسی طرح چشم لیل و نہار

## قصیدہ میر تقی میرؔ در منقبت امام حسین رضہ

فلک کے جور و جفانے کیا ہے مجھ کو نگار — ہزار کوس پہ جائے اک پتیدن دار
خراب کوہ بیابانِ بے کسی ہوں میں — برنگ صورت جرس ہر طرف ہے میر گزار
بغیر خوردن خوں کب نہار ٹوٹے ہے — سوائے گریۂ صبح اب کہاں ہے آب خمار
لگیں نہ داغ سو کیوں چھیکے میرے سینے پر — نمک نہیں نظر آتا بجز رُخِ دلدار
سو وہ بھی دیکھنا ملتا ہے نہیں ہے گو میٹھے — گر ہوں ہند میں رسوائے کوچہ و بازار
سوائے نالۂ جاں سوز کون ہے دل سوز — بغیر آہ سحرگاہ کون ہے غم خوار
جنوں میں جب سے خوش لباسِ عریانی — نہیں دامن صحرا میں تب سے مجھکو قرار
ہمیشہ ساتھ ہے دامن سوار لڑکوں کے — مگر کہ خاک دنا سے بنا ہے میرا غبار
عجب ہے مجھ کو جو تو دیکھنے نہیں آتا — رہا ہوں ایک تیری انکھڑیوں کا میں بیمار
ہوا ہوں جور و فلک سے نپٹ ہی اب نزار — پہنچیو ! یا خلف الصدق حیدر کرار
امام ہر دو جہاں جس کے آستاں کی خاک — رکھے ہے رتبۂ کحل جواہر الابصار
شعاع روضے کے قبے کی ہے گی عالمگیر — پھرے گا سایۂ شب اب جہاں میں تا انوار
بھانے کر یہ نقاشیاں ہیں سب اس کی — زمیں ہو یا ہو فلک یا حجر ہو یا اشجار
یا محمدے کہ نبوت ہوئی اس پر ختم — بفاطمہ کہ وہ ہے بنتِ سید مختار

برتضٰی کہ ولایت مسخر اُن نے کی — بہادری ہے غلاموں کی جن کے فن شعار
باں امام کہ کشتہ ہے زہر قاتل کا — گرے ہیں لخت دل اس کے زمیں پہ کئی ہزار
باں شہید کہ تشنہ لب و شکستہ دل — ہوا ہو دشت بلا میں ہیں اب تلک آثار
کہ جب ہلال محرم نمود ہوتا ہے — جہاں میں کرتے قیامت ہیں اُن کے ماتم دار
بسینہ سوزی داغ و بآتش ہجراں — بآہ سرد سحرگاہی و بہ نالۂ زار
بسرد مہری شیریں بکینۂ خسرو — بگرم جوشی فرہاد و سختی کہسار
بعشق دیر و بطوف حرم بسعی تمام — بلوح مشہد عاشق بسوز شمع مزار
بہ آب رنگ گلستاں بہ بےکسی اسیر — کہ اس کو کنج قفس ہی رہے ہے باد بہار
بعینہ کوبی زخم جگر بماتم تیر — بجاں کنی دگاہ گیر حسرت دیدار
قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی — کہ تجکو علم ہے اُن سب کا کیا کروں میں شمار

یہ آرزو ہے مرے دل میں مدتوں سے تہا
رہے نہ بعد مرے ہند میں یہ مشت غبار

## قصیدۂ ذوق در مدح اکبر شاہ ثانی

قلم جو صفحہ کا غذ پہ ہووے نکتہ نگار — تو ہے نقش مٹادیں جہاں کے جادو کار
سخنوروں نے جو باندھے سخن کے ہیں نیرنگ — زباں سے اسکی ہے وابستہ ان کے سب اسرار
سوار توسن دست رواں پہ ہووے جب — کرے قلمرو معنی کو دم میں تاج گزار

جو شاخ سدرہ پہ بیٹھا ہو طائرِ مضموں    تو اُڑ کے صورتِ شاہیں کرے یہ اُس کا شکار
زبانِ تیغ نگہ سے لیا فسوں شاید    کہ اُس پہ اُڑ کے مضامیں کرتے جی کو نثار
ہیں دست بستہ کھڑے جا بجا ہو لفظ جس کو    کہ لفظ و معنی و مضموں ہیں بے شمار و قطار
ہے کرتی کام جہاں جا کے اُسکی نوکِ زباں    قلم دبیرِ فلک کا ہے واں پڑا بے کار
سخن زباں ہے اور ہے نگاہ دل دل پر    کہ سو ہیں دل تو ہر ایک کی ہے اپنی اپنی بہار
سخن شناس اُنھیں دیکھ کر یہ کہتے ہیں    کہ جو گہر ہے وہی اُس میں ہے دُرِ شہوار
کروں میں اس کو مگر کیا کہ مشتری نہ ہے    متاعِ بخت کو بیچوں جو میں تو کس بازار
شرابِ درد سے دل ہو گیا ہے مست ایسا    کہ شام روزِ جزا تک نہ جس کا اُترے خمار
بنائے ناوکِ تقدیر خاک تو دہ جسے    بچا سکے اُسے کیا خاک بلبلے کا حصار
ہزار درد اُسے بے دردیٔ زمانہ دکھائے    زباں پہ لایا نہ لانے گا شکوہ یہ زنہار
میں لایا سینے میں تھا دل کی جا پہ آئینہ    کہ اہلِ دل اُسے سمجھیں گے مطلع الانوار
سو اُس کو توڑا ہے لوگوں نے سنگِ باراں سے    میں کہتا تھا کہ گھر بار ہوں گے یا گل بار
صفا کا اُس کے اک ادنیٰ سا وصف یہ دیکھو    غبارِ غیر کی خاطر میں ہو تو اُس پہ ہے بار
میں آبگینے کے آگے ہوں آپ شرمندہ    کہ ایک بات سے پڑتے ہیں اُس میں بال ہزار
مگر تردد ایام کیوں کروں اے چرخ    نہیں رہا ترے گردش سے کچھ مجھے سروکار
لے آیا حسن معقد راہِ آستاں پہ مجھے    کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جس پہ لیل و نہار
سحابِ جود سے اُس کے زمانہ ہے گلشن    سنا اُبرِ کرم اُس کے ہیں صغار و کبار

یہ سن کے مجھ سے کہا طبع نے کہ اے ناداں — کچھ اُس کے نام کی تصریح بھی تو ہے درکار
ہے اُس کے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی — کہ جیسے پاس نہ دریا نہ ابر دریا بار
سو میں زباں کو گیا لے کے دل کے دریا میں — مذاق آب گہر میں ہلا لیا کئی بار
اور اُس کے بعد ہوں کہتا کہ نام پاک ہو وہ — جسے نمازوں میں لیتے ہیں سب پکار پکار
خدا کا سایہ ہے اور نائب رسولؐ خدا — محمدؐ اکبر عالم نواز و عرش وقار
ملک صفات و فرشتہ سیر ولی خصلت — بہ دین پناہ و بہ دل و دولت و بہ رُخ انوار
خدا شناس و طریقت نما حقیقت بیں — بدست جود ہے دریا و تمکنت کہسار
نہ حق وصف ہو اُس کا ادا کبھی لب سے — زباں بہ ہر سر مو آکے گر کرے گفتار
ہوا ہوں لے کے میں حاضر تہنیت کے پھول — کہ اور پاس نہ رکھتا میں کچھ برائے نثار
شہا ہے آج اسی شاہزادے کی شادی — جہاں میں جو ہے جہاں گیر شاہ نیک اطوار
پڑھوں حضور میں اک مطلع دعائیہ — قبول جس سے دعائیں ہوں برسر دربار

شہا خدا سے یہی ہے مری دعا ہر بار
کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیری لیل و نہار

## قصیدہ منیرؔ شکوہ آبادی در نعت شریف

شب گزشتہ ہجوم بلا سے تھا میں دو چار — نصیب سوتے تھے فتنے ہزاروں تھے بیدار
مہیب رات تھی ایسی کہ بس خدا کی پناہ — زبان ہر سر مو پر تھی الاماں کی پکار

مکان گور کہن فرش خاک بالش سنگ
کھڑے تھے بجا گئے کے واسطے در و دیوار

وہ زور کرب سے یوں کروٹیں بدلتا تھا
کہ جیسے دغدغے میں رنگ چہرۂ بیمار

نہ لکھ سکے جو اندھیرے میں میری کیفیت
فرشتے کاندھوں سے گھبرا کے اڑ گئے ناچار

عجب نہیں ہے جو آنکھوں کی راہ بھولے نیند
اندھیرے گھر میں غش آ کے پھر گیا کئی بار

نمود کاہکشاں اس طرح تھی اگر دوں پر
کہ جیسے سنگ سیہ پر ہو چیونٹیوں کی قطار

سلائی بن گئی کاجل کی شمع جلتی ہے
عیاں چراغوں سے شعلے کے بدلے کفچۂ مار

جگر سے آہ دکھاتی چلی اُسے مشعل
کبھی جو دم نے کیا کوچۂ گلو میں گزار

سیاہی شب غم دیکھ کر پھرا اُلٹا
نہ پائی راہ عدم دل میں جا چھپا ناچار

اندھیرے میں نہ ملا نیند کو مقام پناہ
لرز کے مُردوں کے آنکھوں میں جا چھپی اک بار

ہر اک شرارہ بنا خال چہرۂ زنگی
چھڑائے آہ نے ہر چند انار آتشبار

ہولے نہ رکھے تھے جگنو کلاہ گردوں میں
ستارے خوف شب غم سے کر گئے نہ فرار

نہاں فلک میں ہوئی کہکشاں مع مہتاب
نگل کے اژدہے من جا کے چھپے ہی تہ غار

میروں کو نہ رہی لعل شب چراغ کی قدر
ہوئی تھی آتش خاموش کی طرح بے کار

ملاپ چاہتے تھے آفتاب سے خفاش
چکور چاند سے پروانہ شمع سے بیزار

زمانہ بیت حزن سے مرے کشیدہ تھا
یہ خوف تھا کہ نہ ہو پایمال جزر جوار

بلا رفیق و قلق ہمنشین و ہم جہاں
ہزاروں آفتیں دربان فتنہ چوکیدار

سرہانے بیٹھی ہوئی بے کسی لئے رومال
کھڑی تھی پائینتی کو یاس جائے خدمتگار

نیا محلہ نئی صحبتیں نئے نئے رنگ — عجیب طرح کے ہمسایہ طرفہ قربِ جوار
زمانے بھر کی بلاؤں میں مبتلا تھا میں — خفا میں جان سے تھا جان مجھ سے تھی بیزار
ادھر تو کھینچتی تھیں سخت جانیاں دامن — اُدھر قضا مرے لے جانے کے لئے تیار
میں طرفہ رد و بدل تازہ کشمکش میں تھا — مرے لئے ہوئی ہستی و مرگ میں تکرار
ہر اک کو دونوں میں دعوائے افضلیت تھا — ہر ایک کرتے تھے اپنی فضیلتیں اظہار
بیان دعویٰ ہستی یہ تھا کہ سُن اے مرگ — میں تجھ سے بڑھ کے ہوں آگاہ صغار و کبار
مرے طفیل سے قائم ہیں آسمان و زمیں — مجھی سے ہے مۂ خورشید مطلع الانوار
مرے پیالے میں آبِ حیات ہے لبریز — تری شراب میں مخلوط زہرِ عقرب و مار
خراب ٹوٹے ہوئے مقبرے تری جاگیر — مرے نصیب میں سونے کے قصرِ مینا کار
مرے نصیب میں بانگِ نشاط و نغمۂ عیش — تری بساط میں ہے نوحہ اور نالۂ زار
کہا یہ مرگ نے بس بس خموش اے ہستی — کچھ اس میں راست کچھ لاف ہی تری گفتار
میں وہ ہوں جس سے لرزتے ہیں سرکشانِ جہاں — میں وہ ہوں جس سے ہیں عاجز ستمگر و اشرار
جو میں نہ ہوتی تو کرتا نہ کوئی طاعتِ حق — جو میں نہ ہوتی تو ہو جاتے سب غریب آزار
مرے سبب سے شہیدوں کو ہے حیاتِ ابد — مرے سبب سے ہیں پیوندِ خاک بدکردار
پسند آتی ہے تو کس کو ضعفِ پیری میں — کہ اپنی جان سے ہو جاتے ہیں بشر بیزار
تری شراب نہیں ہے تمام سے ذائی — نہفتہ نوش میں تیرے ہیں نیش زہر ہزار
زمانے بھر میں ہے شکوہ ترے تلون کا — کسی کے ساتھ نہیں تیری ایک سی رفتار

گزشتہ را صلوٰۃ اب بغور حال کو دیکھ ۔۔۔ کہ تیرے پاس بہت بد ہیں کم ہیں نیکوکار
ہمیرانِ خدا میرے شہر میں سب ہیں ۔۔۔ کہ جن کے نقشِ کفِ پا سے خار ہے گلزار
خصوصاً اُن شہہ انبیا حبیب خدا ۔۔۔ شفیعِ امت و محبوب ایزدِ غفار
منیر مدحتِ حاضر میں عرض کر مطلع ۔۔۔ حضور قلب ہے نعتِ رسول میں درکار
کریں جو آپ عنایت گُلِ چراغ مزار ۔۔۔ نہال طور بنائے اُسے گلِ دستار
ادھر بھی دیکھئے اے رحمتِ مجسم حق ۔۔۔ نثار میں مرے ماں باپ آپ پر سو بار
صلہ یہ مجکو عنایت ہو اس قصیدے کا ۔۔۔ نجات غم سے ہو گزریں خوشی سے لیل و نہار
یہ عرض میری سنو دل سے اے حبیب الاحباب ۔۔۔ عجیب حال میں میں نے کہے ہیں یہ اشعار
خدا ہی اس سے ہے آگاہ غیر کیا جانے ۔۔۔ کہ کس بلا میں گزرتے ہیں مجکو لیل و نہار
اسیر طوطی خوش لہجہ دام آفت میں ۔۔۔ مقام فاعتبروا ہے بہرائے اولی الابصار
قصیدہ سات پہر میں کہا ہے یہ واللہ ۔۔۔ اگر ہو ضعف تراکیب میں تو ہوں ناچار
سُنا جو ہاتفِ غیبی نے یہ قصیدہ منیر ۔۔۔ خطاب تازہ دیا اُس نے مطلع الانوار

## قصیدہ قدر بلگرامی

### در مدح راجہ محمد امیر حسن خاں بہادر والی ریاست محمود آباد

چمن کا بار ہے کلیوں کا ہو گیا انبار ۔۔۔ بندھا عروسِ بہاری کے در پہ بندھنوار
بدل کراتی ہے مشاطۂ صبا جوڑا ۔۔۔ سفید ابر بھی چھایا تو ہو گیا گلنار

دھڑی جمائے ہوئے سوسن اپنے ہونٹوں کو — حنا لگائے ہوئے پنجے میں ہے دست چنار
اُگی ہوئی لب نہر باغ میں کنگنی — بڑھا رہا ہے جو شمشاد طرۂ طرار
گلوں کے چہرے پہ افشاں چنی ہے شبنم نے — جو غازہ ملتی ہے رُخ پر ہوائے فصل بہار
گئی چمن سے اُدھر خواب ناز میں نرگس — ادھر کو سبزۂ خوابیدہ ہو گیا بیدار
اُدھر ہوا سے ہوئے لکہ ہائے ابر نمود — ادھر چمن دمِ طاؤس بن گیا اک بار
اُدھر دھنک نے بھرا اپنی مانگ میں سیندور — ادھر ہوا لب لالہ پان سے گلنار
اُدھر جو نہر چمن کو ہوا نے لہرایا — ادھر بھی کوند کے بجلی دکھا گئی دیدار
اُدھر قصیدے پڑھے بلبلوں نے نالوں کے — ادھر گلوں نے نکالا ہلالِ دست افتار
اُدھر کھلے صدف برگ کے لب تشنہ — ادھر بھی جھوم کے آیا سحاب گوہر بار
اُدھر چمن نے نکالی قبائے استبرق — ادھر گلوں نے سروں پر سجی نئی دستار
اُدھر جو طرۂ شمشاد بڑھ گئے تا دوش — ادھر لٹک گئے سنبل کے شملے تا بہ کنار
اُدھر گھٹا سے ہوئی چشمک یکادُ البرق — ادھر جھک گئی نرگس کہ یخطف الابصار
اُدھر چلی جو چمن میں ہوائے روح افزا — ادھر سحر کو کھلی چشم نرگس بیمار
چمن میں برگ گل تر بصورت لب یار — عجب نہیں ہے اگر قول دیں لب گفتار
عجب نہیں ہے زبان سوسن غنچہ میں — عجب نہیں ہے زباں آوری کرے ہر خار
چٹک چٹک کے غنچے کہیں قم باذن اللہ — عجب نہیں ہے مسیحا نفس ہو باد بہار
عجب نہیں جو یہ سن کے سرو چل نکلیں — کریں چمن میں بگولے کی طرح خود رفتار

عجب نہیں ہے کہ آئینہ آبِ حیواں ہو
عجب نہیں ہے کہ بول اُٹھے طوطی یگانہ

عجب نہیں ہے بقولِ ظہیر فارابی
چمن سے چین تلک ملکِ چین سے تا گلزار

زاعتدال ہو حکم جا نو تغیرو
اگر بنوک قلم صورتے کشند نگار

عجب نہیں ہے کہ جو پھوٹیں حبابِ جیسے
تو بلبلیں بنیں مرغابیاں قطار قطار

عجب نہیں ہے کہ بجلی ہو مرغ آتش زن
عجب نہیں ہے کہ بادل ہو مرغ آتش خوار

عجب نہیں گل لالہ پڑھے جو نال کی طرح
عجب نہیں کہ ہزارے سے نکلے صورت ہزار

صدائے رعد سے من کہ ہر ایک قطرۂ آب
ہوا میں ہنس بنے ہنس سے ہو موسیقار

بنی ہے زخمہ ہر ایک عندلیب کی منقار
جہاں پڑی رگِ گل پہ بجا چمن میں ستار

گرج ہے بادلوں کی یا کمک ہے طبلے کی
جو مور ناچتے ہیں جل رہا ہے سب گلزار

لگائی ہے گل شبو نے منہ سے شہنائی
جو پتے ملتے ہیں جھانجھیں بجاتے ہیں اشجار

اُدھر جو پل کے بجاتے ہیں تالیاں پتے
ادھر ہوا لے بہاری الاپتی ہے بہار

گرے جو برگ ہوا میں اُٹھے وہ رقص کناں
لیے یہ ناچ میں توڑے بہانے ہر اک یار

ہے اس بہار میں ایسا جنون کا جوش و خروش
شمال سلسلہ بجتا اٹھا چمن کا بخار

یہ حال دیکھ کے صوفی بھی وجد کرتے ہیں
ہوئی ہیں حال سے بے حال قمریاں زار

لگا ہی ہے وہ یاں سرو قمری مزب
کہ جیسے کوئی اذاں دے سر بلند منار

زمیں کرنے لگی آسماں سے باتیں
چکور ہو ادھر اس طرف کلنگ و سار

اُدھر تو فاختہ نے غل مچا ہے کو کو کا
ادھر بندھا ہے پپیہوں سے پی کہاں کا تار

ادھر ہے سرو پہ حق سرہٗ کا ہنگامہ — ادھر ہے آم کے اوپر کہوٗ کہوٗ کی پکار
وہ بجلیوں کی چمک اُس پہ بادلوں کی گرج — وہ خندۂ گُلِ تر اُس پہ نالہائے ہزار
وہ آبشار کے لٹکے وہ موج بادِ صبا — وہ قرقروں کی صدائیں وہ سارسوں کی پکار
وہ آمد آندھیوں کی وہ ہوا کا سناٹا — وہ مینہ کا زور وہ پانی کی ہر طرف بوچھار
وہ ساونی کی بہاریں وہ راگ ساون کے — وہ کوئلوں کی صدائیں وہ پینگ مارا مار
یعنی ہے چار طرف ایک اگ رنگ کی دھوم — ہوا ہے سارا سماں بندھ کے باغ کی دیوار
یہی جو دھوم رہی طفلِ غنچہ دلبیں گے — کھلیں گے پھول تو مہکے گا تختۂ گلزار
یہی جو دھوم رہی کان اُڑیں گے پھولوں کے — سُنے گا کون پھر اک آہ بلبلِ نادار
یہی جو دھوم رہی نیند اُڑے گی نرگس کی — نظر لگانے گی صحنِ چمن کو لیل و نہار
یہی جو دھوم رہی سرو اُچھل پڑیں گے تمام — رُکے گا سرو کی چوٹی پہ چرخِ کج رفتار
یہی جو دھوم رہی کانپ اُٹھیں گے دشت و جبل — چمن میں آئیں گے اُڑ اُڑ کے لالۂ کہسار
یہی جو دھوم رہی قدر سر اُٹھائے گا — ہوائیں باندھے گا پڑھ پڑھ مدح کے اشعار
یہی جو دھوم رہی اُس کی مدح خوانی کی — اُٹھے گی چاروں طرف ایک واہ وا کی پکار
یہی جو دھوم رہی چھت اُڑے گی گردوں کی — حجاب اُٹھے گا نظر تیر جائے گی اُس پار
دکھائی دیگا وہ ظلِ خدا وہ عرش مدار — وہ عرش پایہ وہ فرش آشیان وہ عرش وقار
کہ بندگی ہے جسے رتبۂ خداوندی — خدایگان و خداوند نعمتِ ابرار
امیر دولۂ دنیا و دیں سید الملک — جناب امیر حسن خاں بہادر جرار

ہر جان سے قربان اہلِ بیت کرام
ہزار دل سے غلام آئمۂ اطہار

نگاہ روبرو لے قدر دانِ اہلِ کمال
دعا وہ دوں کہ چہرکے جائیں سب اولی الابصار

جہانِ ملک ہے زینتِ فلک کی انجم سے
جہانِ ملک پہ مصابیح دینوی ہوں بکار

رہے وہ نجمِ سعادت ہمیشہ روز افزوں
رہے وہ شمعِ عبادت تمام شب بیدار

خدا کرے یہ قصیدہ رہے امیر پسند
کہ نام دارالامارۃ ہوا ہے اس کا قرار

## قصیدہ نعتیہ از مرزا محمد رفیع سوداؔ

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیحِ سلیمانی

ہنر پیدا اگر اوّل ترک کیجیو تب لباس اپنا
نہ موجوں تیغ بے جوہر دگر نہ ننگِ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی
نہ جھاڑے آستیں کہکشاں شاہوں کی پیشانی

عروجِ دستِ ہمت کو نہیں ہے قدر بیش و کم
سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زر افشانی

کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا
ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے عمرِ خضر طولانی

اذیت حصل میں دونی جدائی سے ہو عاشق کو
بہت رہتا ہے نالاں فصلِ گل میں مرغِ بستانی

ہو قربان اربابِ ہنر کو بے لباسی میں
کہ ہو جو تیغ با جوہر اُسے عزت ہے عریانی

برنگِ کوہ رہ خاموش حرفِ ناسزا سن کر
کہ تا ہو گو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

یہ روشن ہے برنگ شمع ربط باد و آتش سے　　موافق گر نہ ہو شے دوست ہو وہ دشمن جانی

نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا　　نفس جب تک ہو داغ دل سے فرصت کیونکہ ہو پانی

کرے ہے دہر زینت ظالموں پہ تیغ روزی کو　　کہ زیب ترک چشم یار ہے سرمہ صفاہانی

طلوع مہر ہو پامال حسرت آسماں اوپر　　لکھوں گا پھر غزل کر اس میں ہی مطلع ثانی

## مطلع

عجب ناداں ہیں جن کو ہے عجب تاج سلطانی　　فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

نہیں معلوم اُن نے خاک میں گیا کیا ملا دیکھا　　کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی

ہماری آہ دل تیرا نہ نرما دے تو یا قسمت　　دگرنہ دیکھو آئینے کو پتھر ہو گیا پانی

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا　　کہ ہے جمعیت خاطر مجھے اُن کی پریشانی

زمانے میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیراں ہوں　　گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر بآسانی

جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کا ہیڑا تنا ہوں　　کہ اعضا دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھا جگ میں رسم دوستی اندوہ توزی نے　　مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی

سیہ بختی میں لے سودا نہیں طول امل لازم　　نمط خامے کے سر کوٹائے گی ایسی نہ بانی

سمجھ لے نا قباحت فہم کب تک یہ بیاں ہوگا　　ادا سے حسن پیشانی و لطف زلف طولانی

خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے　　نہیں ہے اُن سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل ان کے چشم و زلف کے اوپر　　مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے　　برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیف مسلمانی

زہے دینِ محمدؐ پیروی میں اُس کے جو ہو دیں　　رہے خاک قدم سے اس کی چشمِ عرش نورانی

# قصیدہ مسمی بفریادِ زندانی در نعت حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

## از منشی منیر

رُخِ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغضِ پنہانی
صفائی کی گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی
شکایت بختِ کج کی لکھنے پر آئیں جو زندانی
الف آزادوں کے ماتھے سے مانگے خدا کی پیشانی
ابھی بنا ہے تجھ کو نرگسِ گلزارِ حیرانی
نگاہِ آخری سے ہو وداع اے چشم قربانی
بہت سی فکر کی لیکن سبک ساری نہیں ممکن
مرے زانو کی چھاتی کا ہے پتھر خشتِ پیشانی
جو ہیں آتش مزاج اُن کو نہیں برداشت پردے کی
کسی خلعت سے چھپ سکتی نہیں شعلہ کی عریانی
بگڑنا بھی ہے بننا بھی ہے ہر دم اپنی قسمت میں

نگر ہے تختۂ مشقِ طفلِ مکتب لوحِ پیشانی
مقرر تشنہ کامانِ شہادت کو نہ پہنچائے
سمجھاتے ہیں اسی سے لوہے میں تلوار کا پانی
ہوتے ہیں کفر و اسلام اس قدر آپس میں ہم صحبت
گلے ملتے ہیں ہر زاہد کے زنّار سلیمانی
تکلف خوش لباسی کا رہا ہے بدمزاجی پر
ہزاروں چولیوں میں صرف ہوگی چین پیشانی
ہوا بازار خود بینی میں آئینہ کو بھی نقصان
نہ کھول اے چشمِ قربانی یہاں دکانِ حیرانی
حصیرِ خاک پر نقشِ قدم کی طرح تکیہ کر
سمجھ باد ہوا افسانۂ تختِ سلیمانی
گل داغِ جگر پائے شگفتہ طبع دنیا میں
بجز زخمِ جبیں کوئی نہیں ہے خندہ پیشانی
ملوث ہو چلے اہلِ صفا بھی صحبتِ بد میں
نہیں رہنے کی آب صبح دم میں پاک دامانی
سوائے استخوانِ زانوئے فکرت میں نہیں باقی
بھلا کس تکیہ پر سر رکھ کے سوئے بخت پیشانی

سیہ کاروں کے سر پر افسر عزت نظر آئے
بے: ہیں مرغ جیسے ان دونوں مرغ سلیمانی
پھنسا ہے موزیوں کے قبضہ میں حسن جہاں آرا
قمر در عقرب ان روزوں بنا ہے ماہ کنعانی
غنی ہیں اژدہا و سیل و جغد و بوم ان روزوں
کسے دیں گے سلاطین جہاں جاگیر ویرانی
چنے کھانے کو ترسیں صاحبان گو ہر عالی
صدف کو دے نوالہ موتیوں کا ابر نیسانی
پھنسے ہیں ایک جا دو نی و اعلیٰ واہ ری قسمت
برابر خانۂ زنجیر میں ہے سب کی مہمانی
بچھونا ٹاٹ کمل اوڑھنا ٹھہرا ہے ان روزوں
کوئی اوڑھے بچھائے لے کے ایسا رحم سلطانی
امیروں سے بلائے عذر پہنچی ان غریبوں تک
کہ بے قدری و ضعف حال میں جن کا نہیں ثانی
ہوئے فرماں روا خود مدعی ماخوذ فرمانبر
تامل کی نظر سے اس کو دیکھیں انسی و جانی
کہ جو ہے مدعی قاضی وہی مفتی وہی شاہد

اگر ہو غیر شالث تو عدالت کی ہو آسانی
کرے جو استغاثہ خدمت حکام اعلیٰ میں
بحالی حکم اول کی سنا میں قاضی ثانی
مثال اس کی یہ ہے جیسے بہت بیمار ہو کوئی
گھٹے طاقت مدام اس کی بڑھیں امراض جسمانی
نہایت منت و زاری کرے حاذق طبیبوں کی
نہ سنتے ہوں وہ اس کا شکوۂ آلام روحانی
سنیں بھی تو کہیں بے فائدہ کیوں غل مچایا ہے
وہی کافی ہے پہلا نسخہ اے بیمار نادانی
سزا جو ظالموں کو دی وہ حق تھی چشم ما روشن
مگر ہم سے غریبوں کی عبث کی خانہ ویرانی
سوائے نیش زن زنداں میں ملسکتا نہیں کوئی
ہوئی ہے خانۂ زنبور میں دنیا کی مہمانی
ہوا ہے مشتری محبوس گویا برج عقرب میں
نظر آتے ہیں اہل علم و فضل اس سال زندانی
مٹا ہے نام شاہی ہند سے اسد رحمان روز و ل
نہیں ممکن کہ اب بانات بھی کہلائے سلطانی

جو کل مزدور تھے وہ آج ٹھہرے تاج کے مالک
جو شب کو مہترانی تھی ہوئی دن کو مہارانی
عدالت ان دونوں ایسی بڑھائی ہے زمانے نے
کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں ایک ہی گھاٹ پر پانی
زمانہ کا پتا ملتا نہیں معدوم ہونے سے
مسافر ڈھونڈھتے ہیں اب سرائے عالم فانی
ہوا ہتھیار چھین جانے کی عالم میں چلی جب سے
چلیں گھر چھوڑ کر جنگل کو گجرانی ایمانی
بنائیں بیڑیاں تلوار کو تڑوا کے گردوں نے
کیا ارباب جوہر کو ہر اک حیلے سے زندانی
بہادر نوحہ گو ہیں ماتم مرگ شجاعت میں
بجائے نعرۂ شیرانہ سیکھے مرثیہ خوانی
ہوئے ہیں بے کفن مدفون مثل میت مفلس
سنان گیتو تیغ ہستی گزر نریمانی
ہوا چتر ہما عنقا سے بھی معدوم ان روزوں
پڑے ہیں دھوپ میں محتاج سایہ ظل سبحانی
پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے

الٰہی روئے کس کا سر پکڑ کر تاج سلطانی
کسی نے کوڑیوں کے مول بھی پوچھا نہ ان کو زوں
چڑھی نیلام پر سلطانی و نوابی و خانی
کیا زاغ و زغن نے آشیانہ چتر منزل پر
سر تخت ہما ہیں بوم صرف بال افشانی
پڑے ہیں خاک پر شاہانِ عالم واہ رے قسمت
کمینے ٹھوکروں سے توڑتے ہیں تخت سلطانی
محل سونے کے ڈٹے کھد گئے ایوان مینائی
بنا ہے کہنہ گورستان کی صورت قصرِ سلطانی
محل و باغ کا بئس البدل وحشت فزا ٹرکیں
کہ جن کے عرض سے نادم ہے طولِ عرضِ شیطانی
جہاں دیکھو سڑک پر مجمع وحشت کی کثرت ہے
نظر آتا ہے ہر میلے میں انبوہِ پریشانی
عدالت سے ملی ہے چند بوم و زاغ کو ڈگری
ہوئی ہے ضبط ملک بلبل و طاؤس بستانی
گلستانِ ارم میں دھوم ہے مرگھٹ کی دعوت کی
تکلف سے ہے قیصر باغ میں گھوڑے کی بھانی

ہوئے فاقہ کشوں کے پیٹ نعمت خانۂ شاہی
بنی ہے کیسۂ مفلس در دولت کی دربانی
پریشانی کے ٹھیکے ہیں ہر اک دربار و مجمع میں
اجارہ بستیوں کا لے کے خوش پھرتی ہے ویرانی
اگر اس وقت میں ہوتے تو ڈر سے پھینکتے پھرتے
جناب میر تراخانی متاع خانخانانی
گیا ہی رخت آہنگ کی صورت دماغ حسرت میں
ستم سے سانس لے سکتا نہیں ہے کوئی سامانی
کوئی دریا میں ہے گریاں کوئی خشکی میں بے ساماں
اب اس میں نوح طوفانی ہو یا نوح سامانی
خوشی کے دن بھی عریاں تھے امیرانِ فلک رفعت
ہلالِ عید کرتا کس کے جامہ کی گریبانی
بہار آئی بھی دنیا میں تو دیوانے کہاں ہوں گے
کرے گی بوئے گل کس کے دماغ جاں کی مہمانی
اولوالابصار کو تقدیر نے بالکل مٹا ڈالا
کرے گی سوزن تقدیر کن آنکھوں کی مژگانی
ملا ہے عہدۂ خورشید شاید سعد ذابح کو

کہ لاکھوں ہر سحر تلوار سے ہوتی ہیں قربانی
قضا جتنی معلق تھی وہ مبرم ہوگئی اب کے
لٹک کر پھانسی میں جاتی رہی بنیادِ انسانی
جو دیکھے ناوکِ بیداد حسرت صیدِ زخمی کی
لبِ سوفار دانتوں میں دبائے لعلِ پیکانی
کٹی سرخی سڑک پر جاتے ہیں دیکھنے والے
ہوا ہے خونِ ناحق سے یہ فرشِ خاک افشانی
کہاں کی دایہ آغوشِ لحد میں اب وہ سوتے ہیں
ملک کرتے تھے جن اطفال کی گہوارہ جنبانی
لگا دی ہے جھڑی بھی تیر بارانِ حوادث کی
فلک نے تیرہ بختی کی اگر بخشی ہے بارانی
کہاں کا دانۂ گندم نہ پائی جَو کی بھوسی تک
خواتینِ عظمیہ نے اگرچہ خاک بھی چھانی
لڑے ہیں گورے کالے ہند میں باہم غضب آیا
غرابُ البین کے سایہ سے پہلے ہے یہ ویرانی
جہاں دیکھو سپاہی مست ہیں حکام مجنوں ہیں
اب اُس کو فوجداری کوئی سمجھے خواہ دیوانی

فقیری رنگ کے پردہ میں پنہاں اہل ہمت ہیں
جہاں کی خاک دیکھو ان دنوں مٹی ہے ملتانی
وہی پہنچائے ابدائیں سہارا ڈھونڈئے جس کا
عصائے پیر سے مطلب نہ نکلے غیر ثعبانی
رسائی مہر کی مشکل ہے اب ذرہ کی خدمت میں
فلک پر جائے ظلمانی ہے زیر خاک نورانی
ترقی کو تنزل ہے تنزل کو ترقی ہے
فلک بیش زمیں حاضر ہے بہر تہنیت خوانی
نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرہ میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی
نکلوا کر وطن سے بھر دیا جنگل میں لاکھوں کو
جگہ رہنے کی اب پاتے نہیں غول بیابانی
نظر نے ہزاروں دیو جن جن دن سے گھر چھوٹا
سواد شام غربت تھا نگہ کحل سلیمانی
پھنسا ہے اس طرح مجھ سا مفید خلق مجلس میں
کہ علم کیمیا جیسے دل قاروں میں زندانی
پھنسا دیں شاہدان زود لا کہ آفت میں اس کو بھی

برات گرگ یوسف کی جو چاہے پیر کنعانی
سلاطین قدیمہ کی وفائیں ہاتھ آئی ہیں
بھری ہے کوٹھیوں میں جنس فرعونی و ہامانی
ہوسے ہیں جمع تحت و فوق دنیا اس جزیرے میں
بلندی اور پستی کی یہاں دیکھی فراوانی
بلندی پر چڑھے تو دار پر گویا چڑھے ناحق
جو اتری تو کوئیں میں لے گری گویا گراں جانی
سیاہی جنگلیوں کی ہے سفیدی گورے رنگوں کی
دو رنگی میں پھنسے روز و شب اس ٹاپو کے زندانی
اگر اشیا میسر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی
بڑی قسمت جو ہو دو ٹی دال مل جائے آسانی
اگالی دال کو کھنے کی تے فاقہ سمجھتا ہے
نکمے چاولوں کو جانتا ہے جنس کی سانی
میسر کچھ مرغ دل ہے لیکن گوشت عنقا ہے
جو چاہیں کیوں نہ پشت دست اس ٹاپو کے زندانی
سوائے لخت دل ممکن نہیں ہے عید الضحیٰ کو
اگر کاڈ زمیں تو زفلک کی بھی ہو قربانی

اگرچہ گندمی رنگ کو پیا اس جزیرے نے
نہ پائی ایک دن بھی آرد گندم کی ارزانی
لر وارتہ کشتی یا مٹی کھود و چکیاں پیسو
اگر ہو جاں بلب منہ میں نہ ٹپکائے کوئی پانی
سوا خارش کے دانوں سے ادہر کے دال کی کثرت
زیادہ استخواں ریزوں سے چاول کی فراوانی
لب شیریں کے بوسوں سے بھی بڑھ کر گڑ کی وقعت ہے
نہ پائیں صورت فرہاد اگر سر پھوڑیں زندانی
شکر کے بدلے ریگ ساحل دریا ہزاروں من
کرے کیا خاک کوئی دعوت مور سلیمانی
سمجھ کر شور محشر اس کو مردے چونک پڑتے ہیں
یہ دریا شور کرتا ہے کہ ہوتا ہے جگر پانی
شب و روز اپنی قسمت پھوڑتا ہے سنگ ساحل سے
مفید قیدیاں ہے خاک پتھر اس کی طغیانی
ثقالت آب دریا میں ہے نرمی سنگ ساحل کی
کلیجہ پانی کا پتھر ہے پتھر کا جگر پانی
برستا ہے برابر ابر دریا بار روز و شب

پھرا جاتا ہے سب کے مزرعِ اُمید پر پانی
ملائک قیدیوں کے حال پر شاید کہ روتے ہیں
کہ اک اک قطرۂ باراں میں ہے دریا کی طغیانی
شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
ہجوم کرب جسمانی و فور رنج روحانی
کجا دانند حال ما سبکباراں ساحلہا
کہ کس بحر بلا کی کشتیٔ ہستی ہے طوفانی
ہوا ئے تند سے نخل فلک فرسا اُکھڑتے ہیں
یہی جاتی ہے بارش کے سبب بنیاد انسانی
عذاب قوم نوحؑ و قوم ہود آپس میں توام ہیں
نئی آب و ہوا ہے دعوت اصحاب زندانی
وطن بسکھیروں کا جاگیر ہے یہ مار و کژدم کی
کھلا نا زہر قاتل ہے یہاں کی عین مہمانی
جہاں دیکھو ہے اکل میت و خنزیر کی کثرت
حریص اس کے ہیں از بس چینی و برہما و نصرانی
فغاں خوک مخنوق و نعیق زاغ سنتے ہیں،
یہی ہے راگ صبح و شام ٹوڑی ہے نہ ملتانی

سحر تک شام سے غوغا ہے خرچنگ مفاعل کا
محال و ممتنع ہے دیدۂ مردم میں نیند آنی
وہ گرمی ہے یہاں جو ہند میں موسم ہے سردی کا
حرارت دھوپ کی ہے دو رُخ اجسام انسانی
گئی گرمی تو پھر برسات ٹھہری نو مہینے تک
اُسی برسات سے ہے ہم بغل فصل زمستانی
یہاں ارباب لندن کی بھی رنگت تیرہ ہوتی ہے
بہ مشتی اگر نقرہ دکھائے اپنی جولا نی
سحر کی بھیر دیں کو شام کلیاں اس جگہ سمجھ
کد آرا چاندنی میں ہے اندھیری رات کا پانی
بیاض تخم مرغاں ہے مداد محبرہ گویا
بہ خبث الحدید آئے جو مرد اوید عمانی
اگر بنگلے کے اندیشے تم بھٹا دو اس جزیرے میں
عجب کیا ہے جو پیدا ہو اُس سے زاغ بیابانی
یہاں بیماریاں دیکھیں زیادہ سارے دنیا سے
بنا ہے گیہ امراض گویا جسم انسانی
تمامی عمر کا سرمایۂ طاقت لُٹا تا ہے

پھرا جاتا ہے سب کے مزرعِ اُمید پر پانی
ملائک قیدیوں کے حال پر شاید کہ روتے ہیں
کہ اک اک قطرۂ باراں میں ہے دریا کی طغیانی
شبِ تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
ہجوم کربِ جسمانی و فورِ رنجِ روحانی
کجا دانند حال ما سبکباران ساحلہا
کہ کس بحرِ بلا کی کشتی ہستی ہے طوفانی
ہوائے تند سے نخلِ فلک فرسا اُکھڑتے ہیں
بہی جاتی ہے بارش کے سبب بنیادِ انسانی
عذابِ قومِ نوحؑ و قومِ ہودؑ آپس میں توام ہیں
نئی آب و ہوا ہے دعوتِ اصحابِ زندانی
وطن بسکھیروں کا جاگیر ہے یہ مار و کژدم کی
کھلانا زہرِ قاتل ہے یہاں کی عین مہمانی
جہاں دیکھو ہے اکلِ میت و خنزیر کی کثرت
حریص اس کے ہیں از بس چینی و بربتہا و نصرانی
فغانِ خوکِ مخنوق و نعیقِ زاغ سنتے ہیں
یہی ہے راگ صبح و شام ٹوڈی ہے نہ ملتانی

سحر تک شام سے غوغا ہے خرچنگ و ضفادع کا
محال و ممتنع ہے دیدۂ مردم میں نیند آنی

وہ گرمی ہے یہاں جو ہند میں موسم ہے سردی کا
حرارت دھوپ کی ہے وہ زخ اجسام انسانی

گئی گرمی تو پھر برسات ٹھہری نو مہینے تک
اُسی برسات سے ہے ہم بغل فصل زمستانی

یہاں ارباب لندن کی بھی رنگت تیرہ ہوتی ہے
بنے مشکی اگر نقرہ دکھائے اپنی جولانی

سحر کی پھیر دیں کو شام کلیاں اس جگہ سمجھو
کہ دارا چاندنی میں ہے اندھیری رات کا پانی

بیاض تخم مرغاں ہے مداد محبرہ گویا
ہے خبث الحدید آئے جو مرداریدِ عمانی

اگر بگلے کے انڈے تم بٹھا دو اس جزیرے میں
عجب کیا ہے جو پیدا ہوں اُس سے زاغ بیابانی

یہاں بیماریاں دیکھیں زیادہ ساری دنیا سے
بنا ہے گنجینۂ امراض گویا جسم انسانی

تمامی عمر کا سرمایۂ طاقت لٹاتا ہے

جو بھولے سے کوئی کرمبیٹھتا ہے تپ کی نہانی
دوا کا قحط ہے امراض بے مانگے میسر ہیں
گرانی ہوشیاری کی ہے بیہوشی کی ارزانی
خبر بھی آ نہیں سکتی شفا کی اس جزیرہ میں
گیا ہے اُمتِ عیسیٰؑ نے کیا اس کو بھی زندانی
اجل جس دن سے غوطے کھاکے پہنچی اس جزیرہ میں
نکلتی ہی نہیں ایسی ڈری ہے دیکھ کر پانی
کریں کیا مُردوں کی خدمت کہ میں بے دستِ و پا زندے
بتاؤ ہاتھ کس سے مانگیں پھر فاتحہ خوانی
مناجات دعا و استغاثہ پڑھتے جاتے ہیں
نہیں جاتی نہیں جاتی نہیں جاتی پریشانی
پر روح الامیں دے طائرِ فریاد کو یا رب
کہ اُڑ کر صاف جا پہنچے مدینہ میں بآسانی

---

# قصیدہ موسوم بہ گل عباس

## در مدح مرزا عباس بیگ خان بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ لکھنؤ

### از قدر بلگرامی

مصیبت وہ پڑی ہم پر کلیجا ہو گیا پانی
بنا جو اشک کا قطرہ ہوا لعل بدخشانی

پلک پر جب تلک تھا بس جبھی تک قدر و قیمت تھی
کسی نے گرتے گرتے آنکھ سے صورت نہ پہچانی

جگر کی کاوشوں نے ایک یہ بھی گل کھلایا تھا
سو دب کر خاک میں اب بن گیا وہ جوہر کانی

مگر ہاں انقلاب دہر و گردشہائے دوراں سے
کبھی جب خاک پر بادل کرے گا تیرافشانی

تو ہوگا نامیہ سے کچھ عجب عالم زمانے کا
بنے گا تختۂ صحن چمن اک تختۂ رمانی

بنے گا کوئی تختہ لاجوردی کوئی زنگاری
بنے گا پستئی کوئی کوئی کاہی کوئی دھانی

ہجوم خار ہوگا جا بجا صحرا کی راہوں میں
نئی شاخیں نکالے گی ہر اک شاخ مغیلانی

لٹک کر خاک پر گر جائیں گے شمشاد کے ٹہنے
کہ جس سے زلف سنبل کو بھی ہوگی اک پریشانی

چمن میں ٹہنیاں مہندی کی وہ شکلیں نکالیں گی
کہ رستے باغباں پر ختم ہوگی ہندسہ دانی

ہرے ہوں گے درخت تاک طارم بھی چھا جائے گا
پھلیں گے خوشۂ انگور صحرائی و بستانی

نشیمن سرو پر رکھے گا اپنا طائر سدرہ
کہیں طوبیٰ سے بھی ہوگی زیادہ اس کی طولانی

بنے گا سبزۂ نوخیز ریش خضر صحرا میں
بنے گی عشق پیچاں سے دردیناں سامانی

زمیں باغ دکھلائے گی باغ سبز گردوں کو — دھنک کی طرح سارى کہکشاں ہو جائے گی دھانی
نظر آئیں گی سب پھولی ہوئی شہروں کی دیواریں — بہاراں کے مزے لوٹیں گے ستّادہ زندانی
یہ عالم دیکھکر مجنوں کے زخم دل ہرے ہوں گے — یہ موسم دیکھکر لیلیٰ ابھی ہو جائے گی دیوانی
کہیں سبزے پہ آکر سانپ شب بھر اوس چاٹیں گے — کسی میداں میں کوک اٹھیں گے طاؤس بیابانی
اندھیرا دشت میں کردیں گے گھر کر بانس کے کوٹھے — کہیں پڑیں گے خود بخود شیر نیستانی
زمیں پر سبزہ وہ پھیلے گا مٹ جائیں گے سب جادے — بھٹک کر خضر کو بھی ہوں گی لاکھوں کھکھو کریں کھانی
پہاڑوں پر دکھائی دے گا ایسا لیلیوں سبزہ — کہ گویا جڑدئے ہیں سنگ پر فیروزہ کانی
نہ ٹھہرے کا کبھی نظروں میں سبزہ دشت ایمن کا — کرے گی چاندنی جب کھیت جنگل ہو گا نورانی
کرن پھوٹے گی جب خورشید تاباں کی پہاڑوں پہ — تو نخل طور کی ہر نخل پر ہو گی چراغانی
خمیدہ ہو گا یکسو بید مجنوں سبز ہو ہو کر — ہرا ہو جائے گا اک سمت انجیر کہستانی
کسی جنگل میں ہوں گی بوٹیاں اکسیر کی پیدا — کہیں چاندی کے پیڑ اپنی بھی دکھلائیں گے طولانی
جمے گی اس قدر کائی کہ سب پتھر ہرے ہوں گے — پہاڑوں پر چڑھے گا ہو گا ایسا جوش میں پانی
پڑے گا عکس سبزہ اس قدر انساں کی آنکھوں میں — ہرا ہو جائے گا تارہ نگاہ چشم انسانی
بشر کو یہ گماں ہو گا ہری عینک چڑھائی ہے — نظر دوڑائیں گے جس سمت بڑھ جائے گی حیرانی
زمیں سبز آسماں سبز اس طرف سبزہ ادھر سبزہ — ہری ٹہنی دکھائی دیگی آبادی و ویرانی
گل سرخ ان دنوں مالی کہیں ڈھونڈے نہ پائے گا — جو گلدستے میں ہو گی حاجت گلہائے بستانی
وہ جب میدان باغ و راغ بالکل چھپا رہیگا — سمند فکر کو جب دے چکے گا خوب جولانی

## مطلع

اُدھر پھرتا پھراتا آئے گا وہ ظلم کا بانی ۔ مرا آنسو گرا تھا جس جگہ ہو کر لہو پانی
وہاں وہ خوں گرفتہ آتے آتے دیکھتا کیا ہے ۔ زمیں سے پھوٹ کر نکلا ہے اک نخل بیابانی
درخت ارغواں یا سادنی یا نخل لالہ ہے ۔ وہ بکا نور کا بالکل ہے نخل طور کا ثانی
بھبو کے خون میں ڈوبے ہوئے بس لال انگارے ۔ لگے ہیں تین گل رشک گل مہر درخشانی
کہ جن پر لڑ مرے دل کی تمنا اور نومیدی ۔ کہ جن پر کٹ مرے روح نباتی اور حیوانی
جگر کی تاب طاقت قدر کی آنکھوں کی بینائی ۔ فراغ خانہ ویرانی فروغ سوختہ جانی
جو بو ہے خوں کی بو ہے جو رنگت خوں کی رنگت ۔ صدا جن کے چٹکنے کی صدائے مرثیہ خوانی
غرض وہ معنی بر ہوا اور گل بندہ یا بندہ ۔ بڑھا کر ہاتھ توڑے اُن کو با صد خندہ پیشانی
پھر اُن کے تین گلدستے بنائے واہ ری قسمت ۔ وہ گلدستے ہوں یا گنج طلسم عالم فانی
جہاں کوئی انھیں دیکھے انھیں کا ہو رہے آخر ۔ پھر اُس میں خواہ مومن خواہ ہندو نصرانی
وہ خود مختار بے پوچھے گچھے لے جا کے گلدستہ ۔ حضور ڈائرکٹر نذر رکھ دے اپنی من مانی
وہاں سے پاسے مسٹر مایکٹ کے نام اک چٹھی ۔ مگر ناکام پھر آئے نہ ہے تقدیر ربانی
پھر اُس کو لاکھ میں رد کا کروں سنتا ہے کب میری ۔ کرے مہراج قائم جنگ کی ڈیوڑھی کی دربانی
ملے دربان و خدام و رفیقاں و مصاحب سے ۔ بہر صورت مہاراجہ کو دے گلدستہ ثانی
وہاں سے بھی دبی ہو پھر تو یا تقدیر یا قسمت ۔ سر بازار پڑھواتا پھرے تحریر پیشانی
مجھے جس دم ملے میں یہ کہوں کیوں میں جو کہتا تھا ۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

سنا ہو تو نے بھی ثالث بخیر آگئے تری قسمت — چلا چل ساتھ میرے دیکھ پھر اسرار یزدانی
نیا ارض و سما پائے نیا صحن و فضا پائے — نئی آب و ہوا پائے نیا دا نا نیا پانی
زمیں جس کی فلک ہو آسماں فرش معلّیٰ ہے — عجب صحن کشادہ جس طرح حاتم کی پیشانی
عجب آب و ہوا جس سے دم عیسیٰ ہو شرمندہ — جہاں کی سرزمیں کا اب و دانہ قوت روحانی
کہیں نہریں کہیں گلشن ہرے آگے ہے وہی کوٹھی — جو ہے جنات تجری تحتہا الانہار کی ثانی
رفیع اس درجہ رفعت پست جس سے ہمت حاتم — وسیع اس درجہ وسعت تنگ جس سے عزم سلطانی
سر گردنکشاں سے پگڑیاں جس نے گرائی ہیں — بلندی وہ مہ گردوں گھسے جو کھوٹ پیشانی
سجی اتنی دلہن بھی منہ چھپائے جس سے گھونگھٹ میں — ہزاروں کرسیاں میزیں چلو قصہ ہے طولانی
یہ راز کبریا کیسے چھپائے چھپ نہیں سکتا — کہ ہے ان کرسیوں میں ایک کرسی سب سے نورانی
اسی کرسی پر اک اللہ اکبر عرش کا تارا — کہ جس کے نور سے برق طبیعت کو ہو جولانی
جو یا عباس کہہ کر میں اٹھا لوں نیزۂ خامہ — جو کہہ کر یا علیؑ میں کھینچ لوں تیغ ثناخوانی
ابھی تو مدح کے میداں میں گڑتا ہے مرا جھنڈا — ابھی تو جھولتی ہے عرش سے تیغ زباں دانی
ابھی احسنت گویاں سے وہ سودا چونک اٹھتی ہے — ابھی شاباش خواں ڈرتا آتا ہے خاقانی
ابھی منہ چومتے ہیں آکے جبرئیل امیں میرا — کہ ہاں اس منہ سے نکلے نام عہدہ خاص یزدانی
امیر وقت ڈپٹی میرزا عباس خاں صاحب — کہ جس کی ذات ہے عزت دہ نوابی و خوانی

نمازی متقی پرہیزگار و مومن و صالح
کہ جس کے آب و گل میں ہے قیام رکن ایمانی

# قصیدہ سوداؔ در منقبت حضرت علی مرتضیٰؑ

سنگ کو اتنے لئے کرتا ہے پانی آسماں
منہ پہ لاوے آرسی تا عیب ڈھونڈے مرداں

مستعد اتنا ہے یہ افعی گزند خلق پر
ہیچ اُس کی چال کا دیکھو تو ہے شکل دہاں

خواں پر اس روسیہ کے مت سمجھ تاروں کی نقل
چمکیں ہیں تودے میں خاکستر کے یہ چنگاریاں

ختم اس پر ہو چکی بدخلقی و بدخصلتی
پھر نہ آیا اُس کے گھر اس کا گیا جو میہماں

کام عالم کا بسانِ جو ہے تصویر اس کے ہاتھ
بند رہتا ہے بمعنی گو بصورت ہے رواں

کھولتا ہرگز نہیں ہے کار بستہ سے گرہ
تانہ باندھا چاہے محکم کر اُسے یہ بدگماں

تنگی اوقات کرتا ہے نصیب حسن و لطف
غنچۂ گل اس سبب سے رنگ و بو کا ہے مکاں

دیکھ ٹک احوال عنقا کا کہ اس ظالم کے ہاتھ
نام پیدا گر کرے کوئی تو مٹتا ہے نشاں

پابرہنہ در بدر مجھ کو پھرا دے دھوپ میں
خار کے گل پر کرے دامانِ گل کا سائباں

میل کھینچے دیدۂ بینا میں یہ باریک عشق
پر کرے کحل جواہر لے کے چشم سرمہ داں

ابر دریا بار کو برساوے دشت یاس پر
خشک رکھے مزرع امید ہر پیر و جواں

ہنس کو موتی چگاتا ہے سدا یہ بے تمیز
پوست کھینچے ہے ہما کا دے کے مشت استخواں

دور میں اس روسیہ کے اب بجز بخل و حسد
دوستی کا تو نہیں ہرگز کہیں نام و نشاں

نور منہ پر شمع کے دیکھے تو جلتا ہے پتنگ
دشمنی معشوق و عاشق تک ہے اپنی درمیاں

ہاتھ سے خست کے اس کی جگ میں جیش خاص و عام
حال دشمن دل کرے اب مطلع ثانی بیاں

ماہ کی خاطر مقرر وقت شب ہے ایک ناں ۔ پھر جو یہ چاہے سدا ساری وہ ہووے سو کہاں
اک لب ناں کے لئے حیراں ہوتے شہر شہر ۔ مثل ماہِ نو پڑے پھرتے ہیں عالی ہمتاں
کیا کروں اسکی طبیعت کے تلون کو میں نقل ۔ کیا کروں نیرنگیٔ گردش کا اب اسکی بیاں
آن میں اوجِ حسب کو پہنچے مجہول النسب ۔ خاکِ ذلت پر گرے پل میں فلاں ابن فلاں
تا کجا کہئے غرض اس سفلۂ دوں کے مزاج ۔ اک وتیرے پر نہیں گا ہے چنیں گا ہے چناں
اب کہیں عالم میں لے تو وا نظر آتا نہیں ۔ جز پناہ اُس آستاں کے موضعِ امن و اماں
جس کا پایہ قدر ایسا ہے کہ دیکھیں ہیں جسے ۔ تھام کر دستار اپنی عرش کے باشندگاں
کعبے کو بت خانے سے کرتا نہ ہرگز کوئی فرق ۔ گر نہ ہوتا اس کا واں پایے تو لدو میاں
ہے یداللہ بے شک و لاریب بازوئے نبیؐ ۔ قوت ہر یک ضعیف و طاقت ہر ناتواں

## قصیدۂ امیر مینائی در مدح نواب کلب علی خاں والی رامپور

فصل گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں ۔ بڑھ کے رضوان سے ہے ان روزوں دماغ باغباں
ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے ۔ جیسے صبح عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر ۔ کر رہے ہیں سجدۂ شکرِ خدائے انس و جاں
قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار ۔ جی اُٹھے جو سو گئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں
جھوم کر آیا ہے ابر کوہساری باغ میں ۔ رقص میں ہیں ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں آکر دیکھ لیں ۔ صاف جلوہ ہے چراغ طور کا مجھ سے عیاں

جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا
نگہت گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں

ہر روش پر بیٹھی ہے بزّاز بن کر خرّمی
جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز مخمل کی دکاں

یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہال سایہ وار
ہو خراماں جس طرح کوئی حسین دامن کشاں

ہے مبارک فال کوئی ہونے والی ہے خوشی
ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہے گل فشاں

مومن و کافر سے کہہ دو آئیں سب گلزار میں
عمر کرتے ہیں عبث دیر و حرم میں رائگاں

جس کی کرتے ہیں پرستش جس کی کرتے ہیں طلب
اُن مکانوں میں ہے پوشیدہ یہاں ہر سو عیاں

گرچہ صحن باغ میں ہر سال آتی ہے بہار
اور آتا ہے نظر رنگِ زمین و آسماں

ہے سبب اس کا کہ ان روزوں ہوا مسند نشیں
سرو گلزار ریاست صاحب بخت و جواں

منبع جود و سخاوت معدنِ لطف و کرم
ماہِ اوجِ چرخ قدرت مہرِ اوجِ کن فکاں

نام نامی وہ کہ ہے سکۂ نگین دل پہ نقش
نامور کلب علی خاں بہادر نوجواں

اس کے وصفِ پاک کا دل نے ارادہ جب کیا
بے تکلف آگیا مطلع یہ بالائے زباں

شش جہت میں ہے جو یہ خورشید یکتائے جہاں
گرد پھر پھر کر فدا ہوتے ہیں ساتوں آسماں

حبذا وہ چشم ہو جس کو قدم بوسی نصیب
حبذا وہ سر جو ہو صرفِ سجودِ آستاں

اے خوشا وہ سرزمیں جائیں جدھر اُس کے قدم
اے خوشا کشور پھرے جس کی طرف اسکی عناں

مرحبا اُس کو جو صبح و شام ہے اُس کا مطیع
آفریں اُس کو جو روز و شب ہے اسکا مدح خواں

ہے وہی دل جس میں ہو اُسکی محبت کا مقام
ہے وہی سینہ ہے جس میں اسکی الفت کا مکاں

فی الحقیقۃ ختم ہے اس پر رعایا پروری
واقعی ایسا شریفوں کا کہاں ہے قدرداں

دستگیری کی ضعیفوں کی قوی بازو ہوئے　　حق یہ ہے محنت نہیں جاتی کسی کی رائیگاں
شہرہ بخشش سے خلقت ہو در دولت پہ جمع　　جیسے مسجد میں مصلّی آتے ہیں سُن کر اذاں
آئے اُس کے سامنے مقصود کو پہنچے وہ پیر　　ڈھونڈھتے تھے موسم طفلی سے جو بخت جواں
کلک قدرت نے کوئی کھینچی نہیں ایسی شبیہ　　گو کہ تصویریں ہزاروں ہیں مرقع ہے جہاں
آنکھ نرگس سرو قد رخسار گل غنچہ دہن　　یہ وہ گلشن ہے کہ خود جس کا خدا ہی باغباں
تا کجا طول سخن اب ہے مناسب اختصار　　کس سے ہو سکتا ہے اوصاف مخلّی کا بیاں
جب تلک روشن رہیں افلاک پر خورشید و ماہ　　جب تلک گردش کرے رہنے زمین و آسماں
جب تلک ہو سنگ سے پیدا اثر یاقوت و لعل　　جب تلک شاخوں سے غنچے گل ہوں غنچوں سے عیاں
مثل گل احباب تیرے اس چمن میں سرخ رو　　روئے دشمن زرد یارب صورت بادِ خزاں

## قصیدہ تسلیم در مدح جان عالم واجد علی شاہ اودھ

نغمہ سنجی کے نہ قابل نے سزاوار فغاں　　بلبل تصویر ہوں کھتا نہیں گویا زباں
لاکھ چھیڑے جوش خاطر منہ سے کچھ کہتا نہیں　　بند رکھتا ہوں بہ رنگ غنچہ پیکاں دہاں
ہر طرح پوشیدگی حاصل ہے مجھ کو غیب سے　　سینے میں مانند دل ہوں دل میں ہوں مثل گماں
ہوں زبان بے زبانی زمرداں آگاہ ہے　　میری خاموشی ہے میرے واسطے طرح بیاں
غیر لائے گا کہاں سے لطف مضمون بلند　　قابل پرواز کب ہے شہپر زاغ کماں
چاہتا ہے دخل بیجا سے کرے دل میں جگر　　بدگماں مجھ کو بھی سمجھا ہے مزاج قدرداں

بسکہ ہوں فیضِ نسیمِ دہلوی سے کامیاب
گنگ ہے آگے مرے سحبانِ وائل کی زباں

آفتابِ صبحِ عشرت ہوں ولیکن وائے بخت
ہوتی ہے شامِ مصیبت میرے سائے سے عیاں

بوئے گل ہوں گل کو بھی صحبت مری ہے ناگوار
ہوں سبکروئی سے اپنی طبعِ نازک پر گراں

میں ہوا خواہِ اسیری اپنی آزادی سے ہوں
تنگ ہے وحشت پہ میرے وسعتِ کون و مکاں

جز پریشانی شریکِ ماتمِ ہستی نہیں
ہوں مگر دودِ چراغِ آہِ بزمِ بیکساں

خاک کے بدلے غبارِ دل ہے عنصر میں شریک
جی بھر آئے گر میں دیکھوں سوئے کشتِ زعفراں

گھر گیا خانہ خرابی نے دلِ برباد میں
آجکل ہے اپنا سینہ غیرتِ ہندوستاں

عین پستی میں خیالِ سربلندی ہے وہی
ہوں ترقی آشنا مثلِ غبارِ کارواں

شوکتِ تختِ سلیماں ننگِ ہمت ہے مجھے
گرچہ ہوں منت کشِ پابوسِ مورِ ناتواں

حرف بھی وہ ہوں کہ مٹ کر پھر نہ ہرگز بن سکوں
کلکِ قدرت گر لکھے برسوں زروئے امتحاں

گر مرا ثانی ہوا پیدا بعد میرے جانیو
میں امیرِ قافلہ تھا وہ ہے گردِ کارواں

رفتہ رفتہ اب بدولت بے زری کے دہر میں
بن گیا ہوں اعتبارِ وعدۂ وصلِ بتاں

اتنے بھی بر جا نہیں ہیں ہوش جو آئے خیال
کون ہوں آوارہ کیوں پھرتا ہوں رہتا ہوں کہاں

تا کروں پیدا نہ شکلِ قرصِ ناں پرکاردار
مجھ کو چکر بھی نہیں دیتا ہے نخلِ آسماں

سخت مشکل ہو گیا دم بھر بھی جینا دہر میں
خضر نے کیونکر بسر کی آہ عمرِ جاوداں

عرض میں کس سے کروں یہ ماجرائے بیکسی
دوست دشمن خویش بیگانہ ستمگر مہرباں

دیکھنا کیا کیا فریبِ آرزو سے ہوں خراب
ہاں ذرا انصاف کرنا غمگسارِ قدرداں

مجھ کو سودائے سر گیسوئے بخت ارجمند / اور وہ زنجیر پائے غفلت خواب گراں
ہوشیار اے خامۂ بیہودہ پیما ہوشیار / تا کجا وقف زباں آئین در رسم شاعراں
گل کھلایا چاہتی ہے آمد فصل بہار / رنگ لایا چاہتی ہے اور آہنگ فغاں
پھر دکھاتا ہے ترقی جوش مستانہ سری / کرنی ہے پھر ناز معشوقانہ یہ طبع نوجواں
پھر نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں مجمع احباب کو / پھر رہی ہے پھر مری آنکھوں میں بزم دوستاں
بے تعلق ہوں تعلق کی تمنّا سے مجھے / لپٹی جاتی ہے ہر اک تصویر دیوار مکاں
صورت آدم جو دیکھوں چاک پہلو اس گھڑی / مثل حوّا سینکڑوں پیدا ہوں خیل مہوشاں
مطلع مضمون عالی یاد آیا ہے مجھے / جس سے پیدا ہے عروج التماس قدسیاں

## مطلع

اوج دکھلاتا ہے حسن پست فطرت ہر زماں / بوسہ روئے زمیں لیتا ہے کیا کیا آسماں
دیکھ کر جوبن بہار سبزۂ نوخیز کا / گر گیا نظروں سے حسن سبزۂ روئے بتاں
چوستا ہے ہر دہان غنچۂ گل باغ میں / نرم ہو کر بن گیا ہر خار بلبل کی زباں
جوش مستی میں جوانان چمن کے سامنے / چلتی ہے باد صبا کرتی ہوئی اٹھکھیلیاں
دیکھ کر مستوں کو دحت زر کنار جام سے / ٹپکی پڑتی ہے برنگ اشک چشم گلستاں
عرض رضواں کا بھی نخوت سے نہیں دیتا جواب / بن گیا معشوق بے پروا مزاج باغباں
خستہ و آوارہ و رسوا ذلیل و بے وطن / پھرتی ہے میری طرح باد صباح بے خانماں
منبر ہر شاخ پڑھتی ہے بیٹھی عندلیب / خطبہائے مدحت واجد علی شاہ زماں

جس کی ادنیٰ ریزشِ زر بدولت دہر میں
مختصر ہے طول دامانِ زمین و آسماں

پڑ گئی تھی اک نگاہِ مہر جو رنج زا ازل
آج تک ہے کاسۂ خورشید انور زرفشاں

باعثِ تسکینِ دل آرامِ جانِ مبتلا
لمعۂ نورِ خدا روحِ تنِ روحانیاں

تا کجا تسلیم جوشِ مدح خوانی ہاں خموش
ہو رہے گا پھر کبھی طبعِ رسا کا امتحاں

ہاتھ اٹھا بہرِ دعا جلدی کہ بہرِ بامِ عرش پہ
کب سے ہیں آمادۂ آمین لبِ روحانیاں

اے خدا جب تک عروسِ نظر ہے خاطر فریب
خود ستائی اے خدا جب تک ہے رسمِ شاعراں

اے خدا جب تک پریشاں حال ہے اہلِ سخن
اہلِ معنی اے خدا جب تک ہے رسوائے جہاں

شش جہت میں غیب سے ممدوح کو حاصل رہے
شوکت و اقبال و جاہ و دولت و نام و نشاں

## قصیدہ سودا در مدح نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ

مرغِ معنی کے اگر صید پر اپنا ہو خیال
عرش پرواز ہو تو کھل نہ سکیں اُس کے بال

نہ بچے طائرِ مضموں نظر انداز مرا
فکرِ عالی کی ہے شاہیں مری راہِ نوال

آشنا ہے شعر و سخن پر جو طبیعت میری
معنی پردے سے عدم کے کریں ہیں استقبال

کچھ مجھے تازہ مضامیں کی نہیں سعی و تلاش
پھرتے ہیں ناطقہ میرے کے سدا وہ دنبال

شست و شو دوں ہوں میں الفاظ کو جس پانی سے
دُرد ہے اب گہر سامنے اُس کے وہ زُلال

نورِ خورشید ہو شب گھر سے فلک کے زائل
نورِ معنی سے مری بیت کے ہے دور زوال

جس زمیں پر میں کروں بیٹھ کے مصرع موزوں
واں بجز سرو ہے روئیدگیِ نخل محال

جو زباں واں متبع ہو زباں کا میری
جہرہ ہونے کی فصیحی کو نہیں اُس سے مجال

خامہ کہتا ہے مرا ہے جو فصاحت اک چیز
سو زباں کی ہے مری خادمۂ بے زر و مال

یہ زباں مجھ سے کی خامے کو عطا کرنے سے
میں سمجھتا ہوں جو منشی ازل کا ہے مآل

کہ رہے مدح میں ایسے کی جسے تا بہ ابد
پرورش کرنے میں گزرے کرۂ مہ کی ہر سال

یعنی نواب فلک رتبہ شجاع الدولہ
قائم اس کا رہے تا حشر یوں ہی جاہ و جلال

مطلع تازہ کرے اے خامہ رقم اب ایسا
کہ بہ از مطلع انوار کیا جائے خیال

بہ تمنائے جبیں بدر بھی ہوتا ہے ہلال
بسکہ یاں سجدے کے مشتاق ہیں ارباب کمال

یہ وہ در ہے کہ یہاں آکے بہم پہنچا دے
رتبۂ بال ہما ہر مگس بے پر و بال

کرم انساں پہ جو ہر ہے طبیعی تیرا
خواہ ہو نیک کوئی خواہ کوئی بد اعمال

قول پہ اُن کے نہ ہوتی تری ہمت جو دلیل
پوچھتا میں حکما سے ہے خلا کیونکہ محال

جس گھڑی دہر میں تیرا ہو کف جود بلند
اور اس وقت کوئی تجھ سے کرے آکے سوال

ہو یہ انبار طلا دست تلے سائل کے
کہ جسے پنجۂ خورشید کا پہنچے نہ خیال

نطق نے تیش حرفوں سے ترے عہد کے بیچ
سین و دال و دال و الف و لام کو ڈالا ہے نکال

تیرے شبرنگ کے جلوے کے تئیں جب دیکھے
کہے وہ اُس کو کہ تھا زرہِ حسن و جمال

تیرے ہاتی کا بیاں تجھ سے کروں میں لیکن
چھوٹا منہ اور بڑی بات نہیں اُس کا قال

اس طرح مشکِ رنگیں پہ ہے اُسکی کج باگ
جو فلک پہ شفق شام میں نکلے ہے ہلال

تو ہے جو مہر جہاں تاب بذرات جہاں
مہر کو ذرے سے تشبیہہ ہے تحمیق پہ دال

ختم کرتا ہے دعائیہ یہ سودا یہ کلام     دوست ہوں شاد ترے اور رہیں دشمن پامال

# قصیدۂ ذوق در مدح ابوظفر بہادر شاہ در جشن سال گرہ

حبذا ساقیٔ فرخ رخ و خورشید جمال     مرحبا مطرب ہاروت فن و زہرہ خصال
بارک اللہ کہ دُر افشاں ہے تو اے ابر بہار     خیر مقدم کہ خراماں ہے تو اے باد شمال
للہ الحمد لبالب ہے مئے عیش سے جام     شکر للہ زر گل سے ہے چمن مالا مال
جوش رو ئیدگی سبزہ سے ہوجائیگا سبز     گل زمیں چمن حسن میں تا دانۂ خال
اللہ اللہ ری سر سبزی گلزار جہاں     کیا عجب ہو روش خضرا اگر رنگ ہلال
شرر تیشۂ فرہاد سے پیدا ہوئے گل     بل بے جوش گل خود رو سر دامان خیال
جوش فوارہ ہے واں کثرت تار بارش     سر مجنوں کے بھی آلودہ جہاں گرد ہیں بال
کیا عجب رحمت باری ہے کہ وقت باراں     ابر مردہ سے بھی ہو قطرہ فشاں آب زلال
معجز بادسے مانند عصائے موسے     شجر خشک بھی ہوجائے تر و تازہ نہال
ذوق مستی سے طاؤس چمن میں قاص     شوق آہنگ سے ہے سر دیہ قمری قوال
شور بلبل بھی یہ رکھتا ہے نمک آج کہ گل     بن گیا کثرت شبنم سے نمکداں کی مثال
دیتی ہے طاقت پرواز یہ کیفیت سے     اس ہوا میں ہے بط مے کہ اڑوں بے پر و بال
ہے یہ وہ دور کہ ہر صوفی صافی مشرب     رقص مستاں میں ہے وجد کناں شامل حال
تپلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز     جنبش دست مژہ دے ہے اس انداز سے تال

ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خط غبار  صفحۂ دہر پہ کیا دخل جو ہو گرد ملال
روز جشن آج ہے اس کا کہ جسے کہتی ہے خلق  نائب ختم رسل ظل خدائے متعال
وہ بہادر شہ غازی کہ اگر تیغ اُس کی  اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال
وہ نکو خوئے نکو روئے وخجستہ منظر  وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال
وہ مسیحا دم و یوسفؑ رُخ و داوٗدؑ الحان  وہ سلیمانؑ دش و موسیٰؑ کف و صالح اعمال
چمن خلق و نسیم کرم و ابر سخا  چشمۂ فضل و ہنر کان عطا بحر نوال
مدح حاضر میں پڑھوں اُسکے وہ مطلع جس کے  ہمسری کی نہ رکھے مطلع خورشید مجال
ہو تری یک نظر فیض سے ناقص کو کمال  مہر سے گر مہ کامل ہو وہ ہفتہ میں ہلال
خبر جملۂ عشرت ہے ترا جشن سعید  مبتدا جس کا تھا غرۂ ماہ شوال
ہوتی ہے حیرت توصیف سے تیری شاہا  روش غنچۂ تصویر زباں منہ میں لال
بس دعا ہی پہ فقط ختم سخن کرتا ہے  ق  یہ جو ہے ذوق ثنا خواں ترا در مدح سگال
جشن ہر سال ترا ہووے مبارک تجھ کو  ہے جب تک کہ زمانہ میں حساب مہ و سال

## مضحکات سحر لکھنوی

گردش چرخ سے ابتر ہے زمانے کا حال  ذرۂ خاک ہیں پستی سے نجوم اقبال
ہیں عطارد کی طرح اہل قلم چکر میں  صورت مہ ہیں گردش ہیں تمام اہل کمال
شادی نایاب ہے گانا ہے جہاں میں عنقا  ناچنا طائفوں کا صورت مہ ہے براہ محال

مُفلسی پھیلی ہے اب شہر میں کنگلوں کی طرح — لوگ واقف نہیں دینے سے بجز حرفِ سوال
دینے والا نہیں ملتا کوئی نہ ندوں میں — جمع ہیں قبر پہ حاتم کے ہزاروں کنگال
مدتوں سے نہیں دیکھی ہے روپے کی صورت — لوگ سب بھول گئے سبز تھی یا رنگت لال
لال کہتا ہے کوئی کوئی بتاتا ہے سبز — رات دن رہتی ہے آپس میں یہی قیل و قال
شرطیں بد بد کے رُپے دیکھنے کو جاتے ہیں — چوک میں پوچھتے پھرتے ہیں کہاں ہے ٹکسال
ہیں جو کچھ اہلِ دول اُن کو بھی ہے یہی فکر — ہاتھ آجائے کس طرح سے قاروں کا مال
کوئی مرتا ہے جواں ہیں سے تو خوش ہوتے ہیں سب — نعش پر کہتے ہیں ہنس ہنس کے تمام اہل و عیال
آمد و رفتِ نفس بند ہے دیکھو دیکھو — ہے یہ ادنیٰ سا دلِ تنگ کی تنگی کا کمال
نام کیا لوں ہیں انھیں میں سے ہیں کوئی صاحب — بندہ تھا اُن کی ملاقات کا مشتاقِ کمال
لے گیا اُن کے لئے ایک قصیدہ کہہ کر — ڈیوڑھی پر جا کے کیا آگے جو بڑھنے کا خیال
چوبداروں نے کہا دیکھ کے میری صورت — آپ کیوں ڈھکے آئے ہیں دو شالہ و رومال
کیا کبھی آپ کے گھر میں نہیں کھنے کی جگہ — یہ بڑا موذی ہے قبلہ یہ بڑا ہے چنڈال
کپڑے کیسے کہ کفن تک نہیں بچتے اس سے — تم تو زندہ ہو یہ لے لیتا ہے مردوں کا مال
ڈرتا ڈرتا ہوا اندر تو گیا میں لیکن — پھر سے پر رکھ کے گیا اپنا دو شالا رومال
دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھے ہوئے ہیں زیرِ حضور — جیسے دوکان میں بیٹھے کوئی بنیا بقال
میں نے جاتے ہی کہا قبلہ و کعبہ مجرا — آپ کہنے لگے اچھا ہے طبیعت کا حال
مجھکو نفرت ہوئی سمجھا میں نرا اُلّو ہے — کہ کجا اس کا جواب اور کجا میرا سوال

جانے کی شرم سے میں نے وہ قصیدہ تو پڑھا
کیا کہوں میں کہ جو کچھ مجکو ہوا رنج و ملال

سُن چکے سارا قصیدہ تو یہ ارشاد کیا
آپ نے خوب پڑھا حضرتِ حُر کا احوال

بے تمیزی کا امیروں کی تو یہ عالم ہے
کیا کریں اور کہاں جائیں بھلا اہلِ کمال

جتنے بے دُم ہیں وہ ہمدم ہیں تکلف دیکھو
پشم سب جن کو سمجھتے ہیں وہ ہیں ناک کے بال

رات دن جوتے اُچھلتے ہیں عجب صحبت ہے
ڈھول دھپّے کے سوا اور نہیں کوئی خیال

تما بھتما سے رہا کرتی ہے صحبت ہردم
رجلے خجلے تو مصاحب ہیں کجا اہلِ کمال

# قصیدۂ اِنشا در سالگرہ جارج سوم بادشاہ انگلستان

بگھیاں نوز کی تیار کرالے بوئے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

عالمِ اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور
گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
بیٹھ کر جلوۂ کرسی پہ دکھاویگا پھبن

نسترن بھی نئی صورت کا دکھاوے گا رنگ
کوچ پر ناز کی جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن

اپنے کیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر
غنچہ و گل سبھی اُن کھولیں گے بوتل کے دہن

سبھی مل مل کے بجا دیں گے فرنگی تنبور
لالہ لادے گا سلامی لو بنا کر پلٹن

کھینچ کر تارِ رگِ ابرِ بہاری سے گمی
خود نسیم سحر آوے گی بجانے ارگن

اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلاویں گی
آپڑے گی جو کہیں تہ پہ سورج کی کرن

نے نوازی کے لئے کھول کے اپنی منقار
آکے دکھلاویگی بلبل بھی جو ہے اُس کا فن

نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا گرہ
ساتھ ہولے گی نزاکت بھی جو ہے اُسکی پھبن

جب ہوا کھا کے گھر آویں گے تو دیکھیں گے ناچ
وضع پر ہند کے ہے باغ میں جس کا مسکن

کیا تعجب ہے جو فواروں کی ہو سارنگی
رعد کے طبل بجیں ایسے کہ ہوں مست ہرن

ہیں جو ان خوبوں کے ساتھ وہ ناچیں گے آج
اس میں گر شک ہو تو پھر سن لے تو اے بوئے سمن

آج ہے جون مہینے کی یہ چوتھی تاریخ
کیوں نہ اس روز مبارک کی انوکھی ہو پھبن

اسی میں ہے سالگرہ اُس کی جسے کہتے ہیں
جارج ثالث وجم مرتبہ شاہ لندن

کچھ نہ لندن ہی میں یہ زمزمۂ عیش ہے آج
ہند میں بھی تو ہر اک گھر میں ہے طبلے کی پرن

یہ خبر سُن کے ہوا شاد وہ فخر آفاق
جس کے مقدم کے سبب سے یہ جہاں رشک چمن

یعنی نواب فلک رتبۂ یمین الدولہ
حاتم عہد وجم وقت فلاطون زمن

ناظم الملک بہادر وہ جناب عالی
دب گئے جس سے زمانے کے سب آشوب وفتن

وہ سعادت علی خاں عالیِ اعلیٰ جس سے
جس کے ہے نکہت اقبال سے عالم گلشن

کس نے اس شان کا دیکھا ہے وزیر اعظم
جس کے گھر ہو شرے سلاطین کا مقدو ماتن

اس خوشی کا یہ سبب ہے کہ سب انگریز کے راز
اُس فلک دیدبہ سب آئینہ ساں ہیں روشن

اور انگریز یہ بھی ہیں جو وہ اسرار حضور
پر تو انداز ہیں جو آب میں سورج کی کرن

جب بہم رابطے یہ ہوں تو نہ ہوشے کیوں کر
اس ہما پایہ کا دل گنج طرب کا مخزن

کیوں کہ مالک ہے سب انگریز کا وہ شاہ بزرگ
جس کا جارج لقب اور بندہ ہے سلطان ختن

وصف میں اس کے سنو مطلع رنگیں اک اور
روپ سے جس کے ہو شرمندہ بہار گلشن

اُس کے یوں فرق پہ ہے تاجِ مرصع کی پھبن — صبح کو جیسے نمودار ہو سورج کی کرن
قدر ہر علم کی کی اُس نے یہاں تک کہ بہم — سینکڑوں جمع ہوئے فضل و ہنر کے خرمن
اُس کی افواج نے جا کی مددِ قیصرِ روم — مصر کے ملک سے سب مار نکالے دشمن
قوم نے اُسکی جو دوڑائے سمندر میں جہاز — وہ کیا کام سکندر سے نہ جو آیا بن
جستجو دیکھ نئی اور نکالی دُنیا — رائج اُس میں کئے اپنے ہی کہ جیسے تھے چلن
قوم انگریز یہ ہے ایسی کہ جن سے کانپے — آوے گر فوجِ عفاریت سمٹ آہرمن
کیوں نہ اس قوم سے ظاہر ہو شجاعت ایسی — ان کے ہے سر پہ وہی مہرِ بقا سایہ فگن
دل میں ہے کرکے مخاطب اسے اک مطلع نَو — پڑھیئے ایسا ہی کہ غش سُن کے کریں اہلِ سخن
بیٹھے جب تخت پہ تو وقتِ سخاوت بن ٹھن — مورچھل ہاتھ میں لیکر ہو کھڑا راجہ کرن
ہو سکے وصف ترے کرّ ح کا کس سے پورا — ہے نمونہ اُسی کا مہرِ درخشاں کی کرن
علم گر تیرے زمانہ میں نہ ہوتا رائج — اور ترا ملک نہ ہوتا علما کا مامن
بسکہ تمیز کسی فن کی نہ رہتی باقی — بو علی بیٹھتے بن کر سبھی گنگ والکن
تھے ریاضی میں جو ماہر حکماے یونان — سب بجاتے تھے وہ نقارۂ الملک لمن
پھر ترے عہد میں موجود ہوتے تو انھیں — ایک لڑکا بھی کہتا کہ پرے ہو کودن
ہوئیں تصنیف کتابیں جو ترے عہد میں ہیں — اُن کے آگے کتب ماحنیفہ تقویم کہن
سامنے اُن کے ہے تحریر مجسطی ایسی — جس طرح ہوشے نئی جنس کا میلا پھیٹن
اب دعائیہ یہ انشاؔ کہو انشاء اللہ — مل کے آمین کرو آمین سب اے اہلِ سخن

جب تلک ماہ کے گھوڑے کی فلک ہو گھبی ۔۔۔ جب تلک شام کے ہو ساتھ شفق کی پلٹن
جب تلک چرخ کہن شکل گو رزمیں تہے ۔۔۔ صاحب شرق میں جب تک کہ ہو جنرل کے چلن
شاہ انگلس یہی جارج رہے باعظم و شکوہ ۔۔۔ سب کو بخشا کرے نت سیم و طلا لاکھوں من
کمپنی نور کی جب تک کہ رہے یہ قائم ۔۔۔ بادشاہی رہے اُن کی ہی بہ وجہ احسن
ناظم الملک بہادر سے اور انگریزوں سے ۔۔۔ رابطے یوں ہی رہیں اور محبت کی چلن
دونوں سرکاروں کا اقبال رہے روز افزوں ۔۔۔ دوست سب شاد ہوں پامال رہیں سب دشمن

## قصیدۂ سحر لکھنوی در صفت بہار عیش باغ لکھنؤ

بلبلیں لاؤ برانڈی کی منائیں ساون ۔۔۔ آج کل باغ پہ عالم ہے گھٹا پہ جوبن
ہائے کیا ابر ہے کیا باغ ہے کیا سبزہ ہے ۔۔۔ بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سن سن
باغ بھر میں نظر آتے ہیں کنول پانی کے ۔۔۔ صاف تالاب میں ڈوبے ہوئے شبو کے چمن
شبہ ہوتا ہے کہ اُڑتے ہیں ہوا میں بگلے ۔۔۔ اُڑتے آتے ہیں جو نہروں کی طرف برگ سمن
پانی پتوں سے ٹپکتا ہے شرابور ہیں پیڑ ۔۔۔ دھوئی دھائی روشیں صاف ہیں جیسے چندن
آنکھ ہر بار پھسلتی ہے طبیعت کی طرح ۔۔۔ چکنی رانوں کا سا عالم ہے جہاں ہے پھسلن
باغباں ٹوٹکے کرتے ہیں کہ پانی کھل جائے ۔۔۔ خوف ہے لال کٹہروں کا نہ چھوٹے روغن
اس قدر باغ میں ہے کثرت شبو و سمن ۔۔۔ لیں جماہی بھی تو کھلتے نہیں غنچوں کے دہن
انتہا ہے کہ جگہ نالۂ بلبل کی نہیں ۔۔۔ جس طرح سے کہ گلستاں میں نہیں جائے سخن

دست گلچیں میں جو دانہ کوئی ہو جاتا ہے — شاخِ انگشت نکل آتی ہے یا شاخِ سمن
موسم باروری ہے یہ فضا کے دن ہیں — پیڑ کیا پھلتے ہیں ان زوروں میں پھلتے ہیں بدن
بارہ دریوں میں جو آتی ہے چمک بجلی کی — شبہ ہوتا ہے کہ سب جھاڑ ہوئے ہیں روشن
کیا گھٹا چھائی ہے کیا کوند رہی ہے بجلی — جیسے نیلم کے نگینے پہ جڑا ہو کندن
جس طرف دیکھئے گھنگھور گھٹا چھائی ہے — کئی دن ہو گئے دیکھی نہیں سورج کی کرن
وہ دھواں دھار گھٹا ہے وہ اندھیرا گھپ ہے — شمع سوجھے نہ پتنگوں کو اگر ہو روشن
کس قدر چار طرف ابر ہے ماشاء اللہ — چشم بد دور نہیں دیکھا ہے ایسا ساون
اس قدر زور سے چلتے ہیں ہوا کے جھونکے — پیڑ اس طرح جھکے جاتے ہیں جیسے دلہن
سارے کمروں میں چلی آتی ہے مینہ کی بوچھاڑ — بھیگنے سے نہیں باقی کوئی پردہ چلمن
مینہ برسنے کی ہے آواز ہوا کا غل ہے — شور سے سر پہ اٹھائے ہیں چمن مرغِ چمن
ہر شجر میں قدِ محبوب کی موزونی ہے — آجکل روپ پہ ہے سبزۂ خط کا جوبن
ابر تاریک ہے سب جھول رہے ہیں مہ رو — رات کے دھوکے سے گاتے ہیں گویے ایمن
جا بجا کیاریوں میں ناچ رہے ہیں طاؤس — رنڈیاں گاتی ہیں ہر پیڑ کے نیچے ساون
کیا گلے نور کے پائے ہیں خوش آوازوں نے — نور کی مورتیں ہیں نور کے سب کے بدن
واہ رے نوک پلک واہ ری گرما گرمی — ظلم کی چھاٹولیاں اور ستم کی چتون
سر کے تعویذ قیامت ہیں بلا کے پٹے[1] — اونچی چوٹی ہے غضب قہر ہے نیچی گردن

---

[1] آنکھ کا اشارہ۔ غمزہ ۱۲

طائفے ناچتے ہیں چل رہے ہیں دین گلاس ‏ ‏ ‏ ارہنی، بیلا بجاتے ہیں، فرنگی ارگن
باغ نواب کا تا حشر تر و تازہ رہے ‏ ‏ ‏ جھولیں ہر سال سحر آ کے جنادیں یادن
نجم اقبال ہے صورت مضمون بلند ‏ ‏ ‏ جب تلک دہر میں ہے تذکرۂ شعر و سخن
مصرع قامت انساں ہے زمیں پر جب تک ‏ ‏ ‏ مطلع مہر ہے جب تک کہ فلک پر روشن

# قصیدۂ داغ

## در مدح نواب میر محبوب علیخان بہادر نظام الملک آصف جاہ خلد اللہ ملکہ و سلطنۃ

میں ہوا بادیہ پیما طرف ملک دکن ‏ ‏ ‏ سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گرد دامن
نازنینوں کی کمر بید کی شاخ لرزاں ‏ ‏ ‏ موجۂ ریگ رواں زلف پریشاں کی شکن
بستر قاقم و سنجاب بنا سبزۂ دشت ‏ ‏ ‏ تکیۂ مخمل و کمخواب ہر اک خشت کہن
قطرۂ شبنم ہر خار ہے گوہر بے آب ‏ ‏ ‏ زرد رو لالۂ کہسار سے ہر لعل یمن
شاخ آہو پہ گماں پیچ و خم کاکل کا ‏ ‏ ‏ سبزۂ دشت میں ہے سبزۂ نوخط کی پھبن
ذرّے ذرّے سے نمودار فروغ انجم ‏ ‏ ‏ جادے جادے سے عیاں کاہکشاں کی جوبن
دیکھے کوسوں سے مسافر کہ یہ آئی منزل ‏ ‏ ‏ صبح صادق کی طرح شام غریبی روشن
خاک اس دشت میں اڑتی ہے کہ اڑتا ہے عبیر ‏ ‏ ‏ آ گئے اس خاک کے مٹی اثر مشک ختن
قوت نامیہ اس جوش پہ اللہ اللہ! ‏ ‏ ‏ دانہ موتی کا جو بوئیں تو ہو خرمن خرمن

چوکڑی بھولے جو اس دشت کی سونگھے خوشبو     کہ یہاں آہوئے تاتار کا ہو نشہ ہرن
خار صحرا اسے انگلی کے اشارے سے بتائے     راہ بھولے جو مسافر کوئی آوارہ وطن
دیدۂ غول بیابان نے جلائی مشعل     ہر بگولے سے عیاں رقص بت نسریں تن
زندہ رہتا ہے تن عابد مرتاض کی شکل     خشک ہو کر بھی بیاباں میں یہاں نخل کہن
شجر طور کی مانند منور ہر نخل     مل گیا کیا کہیں اس دشت سے وادی ایمن
آسماں سبز قدم ہو کے بنا سبز اختر     عکس افگن جو ہوا سبزۂ کہسار و دمن
ندیاں کوہ کی ہیں رشک دہ جوئے شیر     جن سے بہتی ہے نہر فردوس کی بھی نہر لبن
موجیں کرتی ہوئی پھرتی ہے صبا مثل نسیم     لہلہاتے ہوئے سبزہ کا نرالا جوبن
حوریں پانی بھریں نگہت کا جو دیکھیں جمگھٹ     ہے اس انداز کا ہر ایک بت سیمیں تن
ایسے جھرمٹ ہوئے باہم ہیں ثریا تمثال     کہ زمیں پر نظر آنے لگے پروین پہ رن
اشہب خامۂ چالاک کی پھرتی ہے عناں     صنعت دشت دجبل سے طرف شہر و چمن
قوت باصرہ و شامہ تم کو ہو نوید     باغ کی مدح میں گل کھلاتے ہیں گلشن گلشن

## مطلع ثانی

وہ طراوت اثر ہے کہ دم سیر چمن     پانی دینے لگے یوسف کا یہاں چاہ ذقن
برگ برگ گل و گلزار یہاں تک پھیلا     جس سے کوتاہ ہے گلچیں کا سر دامن
لالہ و گل نے جو پہنی ہے قبائے رنگیں     دیتی ہے خلعت نورہ زیبا رنگ گلشن
قلقل شیشہ کی آواز ہے بستاں بستاں     توبۂ مے یہ تقاضا ہے کہ شکن در شکن

نوعروسانِ چمن مست ہوئے ہیں کیا کیا / کھینچتی ہے کمر سرو کی بھی شاخِ سمن
وہ رطوبت کا اثر ہے کہ چمن میں خورشید / گوہرِ شبنم شاداب سے بھر لے دامن
بوسئہ تخمِ محبت کو تو پیدا ہو وفا / ڈالئے پرتوِ رخ کو تو اُگے سیبِ ذقن
لائے گر فصلِ خزاں کو فلکِ نیلی رنگ / نیلی پیلی ہو غضب دیکھ کے اسکو بہمن
پرِ پروانہ جھلے پھولوں کو پنکھا ایسا / کہ مٹے شمع کی بھی دل کی لگن دل کی جلن
کیا عجب پہنچے وہاں تک اثرِ فیضِ بہار / فلسِ ماہی بھی کھلیں صورتِ گلہائے چمن
گر یونہیں فصلِ بہاری کو رہا جوشِ عروج / شاخِ طوبیٰ میں عجب کیا ہے کھلائے نسترن
کس طرح دستِ حنائی نہ کرے نخلِ چنار / تیغِ اردی سے بہا کرتا ہے خونِ بہمن
شہر اس شہر کا ہے نام یہی بلدہ ہے / فخرِ کلکتہ و مدراس نظیرِ لندن
ثانیٔ خلدِ ارم بانیٔ تزئین و حشم / رشکِ چین ختن غیرتِ بغداد و عدن
چھپ گئے سقفِ فلک یوں تہِ ایوانِ بلند / قشتری ڈھانک دے جس طرح کوئی زیرگن
روشنی ایسی جواہر کی وہ کانوں میں عیاں / جن کے نظارے سے ہو چشمِ تمنا روشن
ایسے عشرت کدے میں کیوں نہ ہو خلقت دلشاد / ایسے مامن میں نہ کیوں کر ہو زمانہ امن
شحنۂ عدل کا وہ خوف ہے بازاروں میں / نہیں ممکن کہ جو برتن سے بھی کھڑکے برتن
ہاتھ باندھے ہوئے پھرتے ہیں یہاں دستِ دراز / لب سئے رہتے ہیں بے ہودہ سرایانِ سخن
ذی خرد اتنے ہیں ذی فہم ہیں اتنے کہ یہاں / کیا قباحت ہے اگر ما کی جگہ بولئے من
ناظم و ناثر و فرزانہ و دانا و ادیب / عالم و عاقل و علامہ ہر اک ماہرِ فن

حیدرآباد کا بجتا ہے جہاں میں ڈنکا　　نوبتیں کیوں نہ بجیں دھوم سے باون باون
طفل مکتب بھی پڑھاتا ہے فلاطوں کو سبق　　خلق ہوتا نہیں اس شہر میں کوئی کودن
حیدرآباد سے کیوں جائے کہیں عیش ابد　　خوشتر از ملک سلیماں نہ ہو کیوں حب وطن
دشت و کوہ و چمن و شہر کی مداحی سے　　ایسی تشبیب کو زیبا کہیں جاے چمن
چمن آرائے دکن خسرو فیاض و جواد　　جس نے شاداب کیا آب کرم سے یہ چمن
مدح میں اُس کی پڑھوں مطلع رنگیں ایسا　　جس سے لے داغ ہو شرمندہ بہار گلشن

## مطلع ثالث

خسرو تیر فگن تیغ فگن شیر فگن　　میر محبوب علی خاں ملک ملک دکن
دادگر داد دہ و داد رس و داد رساں　　فخر دیں فخر نگیں فخر زماں فخر زمن
پاک دل پاک نفس پاک نظر پاک نہاد　　نیک خو نیک سیر نیک روش نیک چلن
قدرداں قدر کن و قدر فزا قدر شناس　　حاکم علم و عمل بادشہ فہم و فطن
آفتاب شرف و اوج مہ عز و علا　　شمع کاشانۂ دیں اختر بخت روشن
قاطع بغض و حسد قامع بیداد و ستم　　بانی عیش و طرب ماحی آلام و حزن
مجمع جود و سخا مصدر الطاف و عطا　　معدن حلم و حیا مخزن اوصاف حسن
صاحب جاہ و حشم وارث دیہیم و سریر　　مالک سیف و قلم ظل قدیر ذوالمن
تیرے انوار کا پرتو ہے کہ ہے پرتو مہر　　تیرے اخلاق کی خوشبو ہے کہ خوشبوئے یمن
ہاتھ ڈالا ہے محالات میں بخشش نے تری　　کہہ سکے کون عطا کو ترے حصہا ممکن

وہ گہر بار ترا دستِ کرم ہے شاہا
آ گئے اس فیض کے پانی بھرے بھادوں کی جھڑن

حُسن برستی ہے دکن میں یہ مثل ہے مشہور
تو نے برسائے گہرِ فیض سے معدن معدن

فیض ہے کوہ بیاباں کو بھی ہنگام [illegible]
لیتے ہیں لعل و گہر دونوں بچھا کر دامن

کوئی سختی کرے اس عہد میں کیا ممکن ہے
موم سے بڑھ کے ہوا نرم مزاجِ آہن

عہد میں تیرے جو معدوم کیا ہے یہ ہے
کاوش و کینہ و آزار و غم و رنج و محن

جودِ سلطاں سے وہ ممنوع ہے طرزِ سوال
زخم پھیلائے جو دامن تو بنے تر دامن

وہ بھی چھپ چھپ کے یہاں دیکھتا ہے اپنی ہوت
زخم میں ٹانکے ہیں یا درد کے در پہ چلمن

حکمت آموزِ فلاں ہے تری عقلِ سلیم
بات پختہ ہے تری رائے تری مستحسن

آتشِ قہر سے رستم کا بھی ہو زہرہ آب
شمع کی طرح سے گھل جائے تن رُوئیں تن

تیرے مداح ہیں سب اہلِ نظر اہلِ کمال
آنکھ میں گھر ہے ترا تو ہے زباں پر مسکن

سو زبانیں گُلِ صد برگ سے لے قرض ہزار
تو کرے لاکھ طرح سے وہ تری طرحِ سخن

ہیں ترے عہدِ عدالت میں شکستہ احوال
دل شکن، عہد شکن، توبہ شکن، روزہ شکن

بت کدوں میں ہے یہ ماتم تری دینداری سے
بانگِ ناقوس یہ ہوتا ہے یقیں شیون

جھریاں پڑ گئیں آخر کو رُخِ توبہ پر
عصمتی اُس کو سمجھتے ہیں جو تھے توبہ شکن

منہ چڑھے کون تری تیغ کے یہ کوہ شگاف
سر شکن، صف شکن، آہن شکن، البرز شکن

ایک ہی وار میں تلوار کے دو ٹکڑے
مغفر و بکتر و چار آئینہ خفتان جوشن

اتنی حاصل ترے اعدا کو سبکدوشی ہے
تیری تلوار اُڑا دیتی ہے تن سے گردن

## تعریف اسپ

کیا ترے اسپ پری وش کی کروں میں تعریف — خوب سے خوب خوش اسلوب سراسر ہمہ تن
سینہ چوڑا ہے تلی چوڑی ہے سُم چوڑے ہیں — جتنی چھوٹی ہے کمر اتنی بڑی ہے گردن
بال، دُم، یانوں، شکم، کان، کنوتی، پٹھے — ڈھل گئے حسن کے سانچے میں سب اعضائے بدن
جست میں برق ہے اُٹھنے میں پری گشت میں چرخ — پھر سب کرد صفت بوے بہار گلشن
نہ بندھے اسپ فلک سیر فلک سے ہرگز — گر بنے قوس و قزح اُسکی پچھاڑی کی رسن
اللہ اللہ رے اس تیز روی کی تاثیر — نام لے اُس کا تو ہو صاف زبانِ الکن
اتنی سرعت سے نہ ہرگز خبر آتی جاتی — تار برقی میں ہے آمیزش نعل توسن

## صفت فیل

فلک آسادہ تراپیل کہ جس کے آگے — ریزۂ سنگ و حزف سے ہیں سبک کوہ دمن
ہیں ترے فیل کے دانتوں پہ سنہری چوڑے — یا سر طور پہ کا نور کی شمعیں روشن
یوں سر فیل سیہ زر دعماری تاباں — شب کو جس طرح سے ہو چرخ پہ مہ جلوہ فگن
ڈر کے رکھتا ہے قدم برج اسد میں خورشید — دیکھ کر فیل شکاری کو ترے شیر فگن
طمطراق اور تری فوج کا وہ زرق برق — لیس ہر طرح سے ہر ایک رسالہ پلٹن
دکنی و عربی، کابلی و پنجابی — ہر سپاہی ترے لشکر کا ہے رشک ترن
داغ مداح و ثناخواں و ستایش پیرا — اس دعا پہ تری کرتا ہی لب باب ختم سخن
جب تک انداز یہ ہے حسن و جمال دلکش — جب تک اظہار یہ ہے رنگ گل و نسترن

جب تک آفاق میں ہو دولت و ثروت کی نمود  جب تک افلاک پہ ہوں اختر و انجم روشن
جب تک آوازۂ اقبال ہو آویزۂ گوش  جب تک اندازۂ عشرت ہو نہ اندازِ حسن
جب تک انجام کو پہنچے فلکِ پیر کی عمر  جب تک آفت سے ہو اں محفوظ زمیں اور زمن
جب تک اسلام کا ہے نام جہاں میں قائم  جب تک اس نام سے آباد ہے یہ دارِ کہن
بلبلیں شیفتہ جب تک ہوں بہارِ گل پر  اور پروانہ نثارِ سرِ شمع روشن
حسنِ معشوق میں جب تک ہو کمالِ تاثیر  دلِ عاشق میں کبھی جاتی ہو تیکھی چتون
تو سلامت رہے آباد رہے شاد رہے  زار ہو خوار ہو ناچار ہو تیرا دشمن
تیری اولاد کی کثرت ہو تری نسل سے یوں  جیسے اک دانہ سے پیدا ہوں ہزاروں خرمن

سُرخ رو داغ ہو یوں ظلِ کرم سے تیرے
پرتوِ مہر سے جس طرح ہے لعلِ یمن

# قصیدہ ذوقؔ در مدح ابوظفر بہادر شاہ

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطانِ خاور ہو  قمر دستورِ اعظم صدرِ اعلیٰ سعدِ اکبر ہو
عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو  زحل میرِ عمارت ترکِ گردوں میرِ لشکر ہو

سپہر ہفت آسماں جب تک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہِ ہفت کشور ہو

رہے نام سلیماں تا نگیں حکمرانی سے  رہے نام فریدوں تا درفش کاویانی سے

رہے داراکو تا نام اوری تاج کیانی سے  سکندر تا ہو نامی سکۂ کشور ستانی سے

ترا اے خسرو والاحشم عالم مسخر ہو
سریر سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخار ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی  رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی
زمیں میں تا ہو کان اور کان میں جوہر کانی  بہائے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی

تری شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضے میں بحر پُر گہر ہو کان پُر زر ہو

رکھیں تا عود کو آتش پہ اور آتش کو مجمر میں  گل تر تا ہو گلزار میں تری ہو تا گل تر میں
رہے تا قے میں مشک اذخر اور بو مشک اذخر میں  صدف میں تا ہو گوہر اور رہے تا آب گوہر میں

ترے ابر کرم سے باغ عالم تازہ و تر ہو
نسیم خلق سے تیری جہاں یکسر معطر ہو

طریق رہبری میں خضر ہو جب تک ہدایت فن  تمہارا ہووے تا بحر غریق الیاس کا دامن
رہے ادریس تا قطع تعلق سے جناں مسکن  مسیحا کا ہو بالاخانہ تا خورشید سے روشن

چراغ عمر سے تیرے جہاں سارا منور ہو
فروغ اسلام کو ہو رونق دین پیمبر ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو  کرے آراستہ شام اپنے موئے گیسو کو
ثریا نورتن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو  کرے وسمے سے تا قوس قزح سبز اپنے ابرو کو

لب بان خوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سر بدخواہ خندق تیری انگشت، سنان پر ہو

گلستاں میں ہو تا گل اور گل سے شاخ زیبا  نیستاں میں ہو تا نے اور نے سے نغمہ ہویدا
نہال تاک میں انگور ہو انگور میں صہبا  نشہ صہبا میں ہو اور ہو نشہ جب تک نشاط افزا

شراب عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشن جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

رہے تا کام دینداروں کو احکام شریعت سے  خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبے کی زیارت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محراب عبادت سے  نماز اہل سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبے میں ہو نام اور خطبہ زیب منبر ہو
ترا حامی ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و حیدرؓ ہو

قدم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا آگیں  قلم زن تا ہو مشک افشاں کاغذ خط مشک سے آگیں
زباں پر تا سخن ہو اور سخن میں معنی رنگیں  سخن تا داد چاہے اور تا اہل سخن تحسیں

ترا مداح دائم خسرو ذوق سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعا گو ہو ثنا گر ہو

# قصیدہ محسن کاکوروی در مدح واجد علیؒ بادشاہ اودھ

عزیز مصر جب تک مشتری ہو مہر قیصر ہو  قمر پرویز زہرہ مثل شیریں ناز پرور ہو

دبیر چرخ توقیعات میں کسریٰ کا ہمسر ہو  ہو کیواں مثل کے مریخ بہرام دلاور ہو

الٰہی جان عالم بادشاہ ہفت کشور ہو

فلک پر سات اختر ہیں زمیں پہ ایک اختر ہو

ہو جب تک شاخ میں گل گل میں رنگت رنگ میں جوبن  لبوں پر لَے ہو نے میں نغمہ ہو نغمے میں دل ہو دل میں تن

بغل میں شیشہ ہو شیشے میں مے سرمیں شوقِ افگن  ہو دل پہلو میں دل میں مہر ہو مہر میں الفت ہو تن

تری محفل میں دورِ عیش ہم پیمان ساغر ہو

مے و محبوب ہو مطرب ہو ساقی ہو گل تر ہو

رہے تاثیر حسن پاک جب تک طور سینا میں  عزیزِ مصر سے کنعاں رہے مشہور دنیا میں

اُتارا ہو پری زادوں کا دل میں چشم بینا میں  ہو ذکر گوپیاں گوکل میں بندرابن میں متھرا میں

تو محبوب جہاں اے یوسف پاکیزہ منظر ہو

کنھیا برج والوں میں پری زادوں میں اندر ہو

ہو جب تک تخم ریز خاک جوشِ اسمِ نمو کا ہو  نمو سے ریشہ ہو ریشہ بڑھ کر نخل رعنا ہو

نکالے نخل شاخیں شاخ کوپل بھر دو پتا ہو  ہو پتوں میں شگوفہ اور اُس سے میوہ پیدا ہو

نہال عمر شاہنشہ ہمیشہ تازہ و تر ہو

رہے قائم پھلے پھولے جہاں میں سایہ گستر ہو

رہے جب تک بکام تشنہ کاماں رحمت باری  رہے برسات میں ہر جا پہ چھائی ہو بدلی

متاعِ کاروانِ ابر گوہر بار ہو پانی  کنوئیں میں آب شیریں ہو بجائے یوسف مصری

ترا فیض اے سحابِ رحمت ہر دم فزوں تر ہو
کنواں ہو نہر ہو گنگا ہو قلزم ہو سمندر ہو

ہو جب تک کان میں زر اور زر سے اُس کی وقعت ہو
رہے حاجت روا زر اور زر کی سب کو حاجت ہو

ہو گوہر بحر میں اور بحر کو گوہر سے عزّت ہو
رہے گوہر میں آب اور آب سے گوہر کی قیمت ہو

ترے دستِ کرم کا قبضہ ہر اک بحر و کاں پر ہو
ترے ہاتھوں سے خالی بحر ہو ہر کان پُر زر ہو

ہو جب تک کیمیا نایاب تر نوگر دو محرم سے
رُخِ اہلِ ہوس ہو زرد تر زر نیخ اخضر سے

رہے چاندی مراد اکسیریوں میں ماہِ نو رسے
عبارت زہرہ ہو سیماب سے اور شمش ہو زر سے

ترے در پر ہوس کا دامنِ امید پُر زر ہو
ہو سنگِ آستاں پارس تو درباں کیمیاگر ہو

ہو جب تک ہمت لشکر کشی فغفور و خاقاں میں
رہے خوں ریزی کا نشہ دماغ کج کلاہاں میں

کمال جوہر شمشیر سازی ہو صفاہاں میں
چلے تیغ یدِ بیکر پری کی چال میداں میں

تو امداد پہ مظفر ہو ترا اللہ یاور ہو
کمر میں ذوالفقار اور بازوؤں میں زورِ حیدر ہو

ہو جب تک بر میں دل اور دل میں درد اور درد میں زاری
تر ابرو ہو آنکھ اور آنکھ میں اشکِ الم اشک ہو جاری

ہو پانی میں تیغ میں پانی میں زہر اور زہر کی کاری
ہو غش سکتے میں غش میں بیخودی اور بیخودی طاری

ترے دشمن کو دنیا میں نہ آسائش میسر ہو

نہ بیٹھا کشتہ و خستہ سراسیمہ و مضطر ہو

ہے جب تک سیر فرقدین اک تنگ جوڑی پر — فلک پر دانیوں میں مہر کا نقرہ نام آور
زری کا زین پوش سبزہ گردوں بنے یکسر — ہو شب کی آبنوسی پالکی میں کہکشاں جھالر
سواری دیکھ کر تیری جہاں حیران ششدر ہو
زبانوں پر تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر ہو

ہے خوشبو میں جب تک فرحت اور خوشبو نسرین میں — ہو نسرین باغ میں اور باغ چشم شوق گلچیں میں
ہو چین سنبل میں سنبل کی شباہت زلف مشکیں میں — رہے نافے میں مشک اور نافہ ناف آہوئے چیں میں
دماغ جاں ترے اخلاق عالی سے معطر ہو
شمیم نکہت عالم نوازی روح پرور ہو

شرف حاصل ہے جب تک سخن سے نفس انسانی — دہن میں ہو زباں اور ہو زباں میں گوہر افشانی
ہو موزوں صحبت احباب میں رسم غزل خوانی — مسلم اس مسدس سے ہو محسن کی سخن دانی
ستائش میں تیری ہو جو سخن جس کی زباں پر ہو
غزل ہو یا قصیدہ یا مخمس یا معشّر ہو

# قصیدہ احسنؔ مارہروی

## بتقریب جشن تاج پوشی جارج پنجم ملک معظم سلطنت برطانیہ عظمیٰ و قیصر ہند سنہ ۱۹۱۱ء میں بمقام دہلی بھیجا گیا جس کے صلے میں ایک تمغہ عطا ہوا

عروس باغ جب تک تاج نوشاہ گل تر ہو
صبا فراش گل جاروب سنبل سبزہ بستر ہو

نگہبانوں میں نرگس چوبداروں میں صنوبر ہو
غرض جب تک یہ نیرنگ بہار روح پرور ہو

الٰہی جارج پنجم بادشاہ ہفت کشور ہو
وہ مثل شاہ خاور ہو تو عالم شکل اختر ہو

زمین دہر پر ہوتے رہیں جب تک شجر پیدا
شجر کرتے رہیں جس وقت تک برگ و ثمر پیدا

ثمر میں لذتیں کرتی رہیں جب تک اثر پیدا
اثر جب تک کرے نیرنگیاں شام و سحر پیدا

الٰہی سایۂ رحمت ترا میری کو تن پر رہو
ترا سایہ ہو سر پر جس کے پھر کون اس کا ہمسر ہو

چمن میں گل ہوں جب تک اور گل میں نکہت تازہ
حسینوں کے لیے جب تک بنے گلگونہ و غازہ

اٹھائے سرو جب تک اپنی آزادی کا خمیازہ
بہار عیش پر جب تک ہو سوا گلشن کا دروازہ

شمیم فیض سے شاہا تیری دنیا معنبر ہو
نہال عیش کی ہر شاخ تیری بار آور رہو

رہے جب تک زمین و آسماں میں جب تک خشک و تر باقی — تر و خشک زمیں پر ہیں جہاں تک بحر و بر باقی
جہاں تک بحر و بر میں جزر و مد کا ہے اثر باقی — اثر کو ہے دعاؤں سے تعلق کچھ اگر باقی

ترے اقبال کا تارا مثال مہر انور ہو
ترا ہر آئینہ بردار قسمت کا سکندر ہو

ہے جب تک شفق گلگونۂ روئے آسمانی کا — فلک جب تک ہے مشتاق اندازِ جوانی کا
جوانی میں مزا آئے جہاں تک زندگانی کا — دکھائے زندگانی جب تک کامرانی کا

ترے قلعے میں عیش جاوداں یوں جلوہ گستر ہو
کہ اُس کے ساتھ سامان مے و مینا و ساغر ہو

ہے انداز چرخ پیر کا جب تک یہی پہلا — کھلے چشم فلک جب تک مثال نرگس شہلا
بنات النعش کا دل جب تک آپس میں ہی بہلا — جہاں تک صبح محشر زندگی شب کو نہ دے ٹہلا

ترے انوار کا پرتو یہ ہر دیوار و در پر ہو
کہ فرزند سرکیل اک تصویر برج مہر انور ہو

کتابوں میں ہے مذکور شاہان سلف جب تک — نہ آنے پائے ان اذکار پر رنگ کلف جب تک
کرے از بر یہ افسانے ہر اک نسل خلف جب تک — نہوں گنجینۂ تاریخ سے یہ دُر تلف جب تک

یہ رتبہ بادشاہانِ جہاں میں تیرا اکسر ہو
کہ تیرا نام نامی سب سے اوّل سب سے برتر ہو

رہے جب تک سمندر اور سمندر میں رہے پانی — رہے پانی میں جس دم تک روانی اور جولانی

رہے جبتک روانی میں برابر جوش فیضانی ۔۔۔ رہیں سیراب جبتک جوش سے شہری و دہقانی
تری دست سخا کا فیض دریائے کرم پر ہو
تری مٹھی میں آ جائے صدف سے دُر جو باہر ہو
اثر تولید کا جب تک ہے جسم عناصر میں ۔۔۔ برابر کی رہے جبتک خوشی باطن میں ظاہر میں
رہیں پیش نظر نیرنگیاں جب تک مناظر میں ۔۔۔ رہے جس وقت تک باقی دم پرواز طائر میں
ہما اقبال کا تیرے فلک سیر و ملک پر ہو
ترے دست کرم کا سایہ جس پر ہو وہ افسر ہو
زمیں کے پردے میں جبتک چھپے ہیں خاک کے جوہر ۔۔۔ جہاں تک جوہروں میں قوت نامیہ ہے مضمر
شجر جس وقت تک نامیہ سے ہوتے ہیں بار آور ۔۔۔ رہے ذروں میں جبدم تک شہ خاور کرم گستر
ترا ہر معتقد یوں باادب تیرے برابر ہو
کہ جیسے خیل انجم گرد پیش ماہ انور ہو
رہے دنیا میں آگ اور آگ میں جبتک رہے حدت ۔۔۔ پھر اُس حدت میں بھی ہوتی رہے جب وقت تک شدت
پھر اس شدت میں برقی مادے جبتک کریں جدت ۔۔۔ پھر اس جدت کی بھی گزرے نہ جبتک حشر تک مدت
ترے دشمن کا دل ٹھنڈا نہ دنیا میں گھڑی بھر ہو
بھسم وہ آتش رشک و حسد میں جل جلا کر ہو
رہے مذہب کی جبتک شان و شوکت ربع مسکوں میں ۔۔۔ بجے جبتک اذاں کی پنج نوبت ربع مسکوں میں
ادا جب تک خدا کی ہو عبادت ربع مسکوں میں ۔۔۔ کلام حق کی ہو جب تک تلاوت ربع مسکوں میں

حمایت پر مسلمانوں کی تو اے بندہ پرور ہو
ترا حامی ہو عیسےٰ مصطفےٰ ہو رب اکبر ہو

ہے فن ادب میں شاعری جس وقت تک داخل — کریں جس وقت تک ارباب شوق اس علم کو حاصل
اٹھائیں جب تک اہل ذوق اس سے لذت کامل — جہاں تک طبع موزوں شعر گوئی پر ہے مائل

زمانہ مثل احسنؔ تیرا مداح و ثناگر ہو
کوئی صنف سخن تعریف سے تیری نہ باہر ہو

## قصیدۂ سوداؔ در منقبت حضرت علی مرتضیٰؓ

بسان دانۂ روئیدہ ایک بار گرہ — کھلے جو کام سے میرے پڑے ہزار گرہ
معقد اتنی ہے خاطر مری کہ جائے نفس — کروں گا میں دم واپسیں شمار گرہ
عجب نہیں عوض اشک چشم سے میری — چوئے برنگ سحاب تگرگ بار گرہ
نہ لٹ دھوئیں کی ہے یارب زلف محبوباں — رکھے ہے کیوں مری خاطر کو روزگار گرہ
فلک کو پہنچے سر گردباد مجھ دل کا — جو ساتھ آہ کی پیچش کے ہو غبار گرہ
طرح ہلال کا ہوتا ہے ناخن تدبیر — کشادہ کار ہمارے میں بدر وار گرہ
گیا ہے چھوڑ کے یوں دل میں عقدۂ غم تیرا — کہ بند پا میں دے جائے جیسے یار گرہ
جہاں میں جو ہے گرہ اس کو پائداری ہے — نہیں جو بستگی دل کی پائدار گرہ
کھلے نہ اب جرس دل کے نالہ کرنے کو — ہمارے شاک کے ہے قافلے میں یار گرہ

برنگِ شیشۂ مے وقتِ اشک ریزی کے — گلے سے پڑتی ہے دل تک ہزار گرہ
سوائے ناخنِ دستِ فنا مرے دل سے — کھلی نہ بحرِ جہاں میں حباب وار گرہ
علاج قتل ہے واشد کا کہ اب مری گردن — پہنچتی ہے بدمِ تیغ استوار گرہ
کرور مرتبہ فصلِ بہار میں کھولی — صبا نے غنچوں کی جا سوے لالہ زار گرہ
ہزار حیف کہ یہ میرے دل کے رشتے کی — کھلی نہ اے نفسِ سرد ایک بار گرہ
غلط ہے تو جو زمانے میں سمجھے یہ سودا — کہ کار بستہ سے یاروں کے کھولیں یار گرہ
بغیر ناخنِ شیرِ خدا جہاں میں کوئی — کسی کے کام کی کھولیں نہ زینہار گرہ
غضب کے پنجے سے جس کے بزنگِ دانۂ اشک — نہ آسماں کی ہو جائے تار تار گرہ
جو اُس کے عدل میں خس منہ پہ میچ کے آجائے — تو ہو ہمٹ کے وہیں بحرِ بے کنار گرہ
کیا ہو دل میں خیال اُس کے وصف گلگوں کا — ہوئی ہے غنچے میں اب بادِ نو بہار گرہ
ثنا میں اُس کی دلے کیوں کہ اب بندھے مضمون — ہوا کے دے نہ سکے کوئی زینہار گرہ
دغا کے روز عدو کو جو تو اٹھا لیوے — سناں یہ بھالے کی سینے سے کرد و چار گرہ
تو تیز باز کبوتر کی طرح سے ہر دم — لگے وہ کرنے ہوا زیج بار بار گرہ
وہ تیری ذات ہے مشکل کشا کہ جو کھولے — جہاں کے کام سے کیا لیل دکیا نہار گرہ

کروں ہوں ختم دعائیہ پہ سخن کہ ادب
زباں کو دے ہے خموشی سے شعلہ وار گرہ

# قصیدہ منیرؔ شکوہ آبادی در مدح نواب کلب علی خاں والی رامپور

پڑی ہے مجھ سے عناصر کے دل میں یار گرہ — بساطِ عمرِ رواں کا ہے عرض چار گرہ

بتوں کی بالیوں کی گونج تک نہ پہنچے گی — کھلائے مچھلیوں کو گولیاں ہزار گرہ

سلام لیتے ہی میرا جبینِ جاناں پر — دمِ عتاب بھی ہے میری غمگسار گرہ

بتوں نے زلفوں سے شاید اسے نکالا ہے — کہ آبلہ ہوئی بہرِ دہان مار گرہ

علاقہ چاہئے طوفانِ نوح سے کچھ تو — ہمارے آنسوؤں کا باندھتی ہے تار گرہ

جو پوچھے غنچے سے احوالِ رخت گل کوئی — نہ کھولے بھید کی گٹھری کو زینہار گرہ

جو دیکھ لے مرے خورشیدِ داغِ دل کی تپش — برنگِ قطرۂ شبنم ہوا شکست بار گرہ

پڑی جو تیوری میں عالم وہ حسن کا نہ رہا — کسی سے سیکھ گئی نشہ کا اُتار گرہ

پھنسا سکے گی نہ پھندے میں مرغِ زیرک کو — بنائے حبل اگر ان دلوں ہزار گرہ

سمجھ لے قدر جو اکسیرِ خاکساری کی — تو اپنی گانٹھ میں باندھے مرا غبار گرہ

سبیلِ آبلۂ پا جو تم نے رکھدی ہے — بنی ہے عینِ عنایت سے آبدار گرہ

ہمارے آنسوؤں سے کیا کسی نے دی تشبیہ — ہوئی برنگِ گہر صاحبِ اعتبار گرہ

جو میری رشتۂ مقصد میں پیچ ڈالے گی — تو دیکھنا کہ بہت ہوگی بہت شرمسار گرہ

میں اُس کی خدمتِ عالی میں عرض کردونگا — کہ جس کے ناخنِ ہمت سے کی ہے خوار گرہ

جنابِ کلب علی خاں خدیوِ عالی جاہ — کرم سے جس کے ہے دنیا کی مالدار گرہ

جو اس کی سالگرہ میں نہ اس کو ہوتا دخل — نہ کرتی سجدۂ انجم پہ افتخار گرہ
سناؤں مدح مبارک حضور میں آکر — دکھاؤں زلف سخن کی میں پیچدار گرہ
جگہ ملی ہے جو تیری قبائے زینت میں — ہوئی ہے آج کھلے بند دں آشکار گرہ
تمہاری سال گرہ کو جو کہکشاں کہدوں — دُرِ نجوم گرہ پر کرے نثار گرہ
بندھی ہے جب سے ہوا باغِ بزم والا کی — بغل میں رکھتی ہے خوشبو کہ غنچہ وار گرہ
نثار کرنے کو ہے قصد عقد پروین کا — کچھ اپنی گانٹھ میں لائی ہے اب کی بار گرہ
اگر ہو ناخن والا سے ہم کنار گرہ — نہ پائے ناف زمیں بن کے اعتبار گرہ
حضور ناخن والا کبھی نہ ٹھہرے گی — یہ بات گانٹھ میں باندھے ہزار بار گرہ
جو بحر مدحت والا سے تر زباں ہوگا — کھلے گی پھونک سے اُس کی حباب وار گرہ
پڑی ہے سال گرہ میں حضور کے صد شکر — بڑھائے تار زبانہ کیوں عنکبوت وار گرہ
ہوئی سخاوتِ والا سے یہ کشائش کار — کہ بے وطن زرِ مسک ہے بے دیار گرہ
دعا ضرور ہے اب ختم کر قصیدے کو — ردیف کو نہیں ملتی ہے زینہار گرہ
خدا دراز کرے عمر عیش و عشرت میں — رفیق سالگرہ کی ہو لاکھ بار گرہ
رہے شگفتہ ہوا خواہوں کا ریاض امید — نسیم صبح سے کھل جائے غنچہ وار گرہ
عدو رہیں گے گرفتار عقدۂ مشکل — پڑے گی رشتۂ مقصد میں بار بار گرہ
حقیر کو ہے کشائش کی آپ سے امید — ردیف کے لئے کی عمدہ اختیار گرہ
سپردِ ناخنِ سرکار کر دیا ہے اب — ہمیشہ کھولتے تھے شاہ ذوالفقار گرہ

# قصیدۂ سوداؔ در مدح نواب وزیر الممالک آصف جاہ نظام الملک

لکھے ہے کاتب دیواں سے منشی تقدیر — سمجھ کے دفتر قسمت کیا کر اب تحریر

یہ روز و شب تو بنائے گا تا کجا اس طرح — کہ جام مہر میں آتش نئے مہ کو کاسۂ شیر

گمان و عہد نہ کر اب تو بحر دنیا سے — گہر نکالے تو عریاں حباب پہنے حریر

رہائی اس میں تیری ہے کہ کاغذ سابق — درست کر لے عطارد کو کر کے اپنا مشیر

وہ سلطنت کہ نمونہ جسے خدائی سکا — کہیں ہیں شرق سے تا غرب ہر صغیر و کبیر

سنا نہیں ہے کہ غازی دیں عماد الملک — جو میر بخشی تھا واں کا سو اب ہوا ہے وزیر

اگر طلب کرے کاغذ وہ تجھ سے اے ناداں — تو کر سکے گا پھر اُس وقت اس کی کچھ تدبیر

دیا جواب یہ اُن نے کہ میرے کاغذ میں — حضور اس کے کسی وجہ کی جو ہو تقریر

یقیں ہے خامۂ دست کرم سے اسکے مجھے — سوائے عفو مرے حق میں کچھ نہ ہو تحریر

مری خطا بھی ہے کچھ چیز اس کی ہمت پاس — ہر ایک لحظہ جو بخشا کرے ہے گنج خطیر

گہر فشاں ہے سدا دست فیض کا اس کے — تگرگ بار نہ ہو جس کے ابر عشر عشیر

غنی ہوا ہے یہ اس کے کرم سے ہر محتاج — کہ فرق ہو نہیں سکتا بہم امیر و فقیر

تمیز کیا کروں اجرائے کار کی اس کے — کہ جس کے رمز کو پہنچے نہ آسماں کا دبیر

دو دام زلف بتاں سے کرے اسے تنخواہ — جو مانگے خرقۂ عشاق سے کوئی جاگیر

بیاں میں کیا کروں اُسکی شجاعت اب جسکو — یہ کہتے ہیں صف مرداں میں کیا جواں کیا پیر

عجب نہیں ہے کہ قالب تہی کرے مریخ — اگر وہ چرخ پہ چڑھتے سنے تری شمشیر
ستم جہاں سے ترا عدل یوں کرے معدوم — کہ جیسے خامۂ تریاق زہر کی تاثیر
یہ پرورش ہے جہاں کی تری عدالت سے — کہ شیر کا بچہ گو سفند ہے ہمشیر
وہ کشنہ کون سی ہے پردۂ عدم کے بیچ — کہ تیرا مدرکہ اس کا ہوا نہ ہووے ہژیر
مدبری کی تری کیا ثنا کرے کوئی — کہ جس کے حق میں یہ مطلع ہے مثل مہر منیر
نہیں ہے معجز عیسیٰ سے کم تری تدبیر — کیا ہے زندہ مہر تو سے جن نے عالم گیر
رواج دین نبی کا یہ عہد میں تیرے — کہ شکل انس یہ عائد نہ ہووے اب تکفیر
اگرچہ فتح دکن بیچ جا کے اکبر نے — لیا ہے بھاگ نگر اور قلعۂ آسیر
عزیمت اسم کو تیرے اگر پڑھے کوئی — کرے وہ ہند میں بیٹھا ستاروں کی تسخیر
جو تیری ذات سے ہر نیک و بد نے اپنا کام — کیا درست سو اُس کو میں کیا کروں تقریر

## قصیدۂ ذوق

۱۸۵۱ء میں سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے تو بڑی خوشی ہوئی۔ غسل صحت کے موقع پر یہ قصیدہ کہا گیا، جس کے صلے میں خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عنایت فرمایا گیا۔

زہے نشاط اگر کیجئے اُسے تحریر — عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیئے تو پیدا ہو — نفس کے تار سے آواز خوش ترانم و زیر

کرے ہے وا لبِ غنچہ دُر ہزار سخن — چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر
کچھ انبساط ہوئے چمن سے دُور نہیں — جو وا ہوا غنچۂ منقار بلبل تصویر
اثر سے بادِ بہاری کے لہلاتے ہیں — زمیں پہ ہمسرِ سنبل ہے موجِ نقش حصیر
ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ — کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر
ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دودِ گلخن بھی — برستا اٹھتا ہے آتش سے مثلِ ابرِ مطیر
چمن میں ہیں یہ درختانِ سبز پر جوبن — کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطۂ کشمیر
نہ کیوں کہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع — کہ آتی ہے نظر اک قدرتِ خدائے قدیر
ظہورِ نرگس و گل، جلوۂ سمیع و بصیر — نسیم نکہتِ گل، اظہر و لطیف و خبیر
ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہ عیش و نشاط — کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ — نتیجہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر
دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے — ضمیرِ خلق سے اے بادشاہِ پاک ضمیر
رہا نہ کوئی گرفتارِ رنج عالم میں — چھٹے جو تیرے تصدق میں مجرمانِ اسیر
شہا ہے دم سے ترے زندگانیِ عالم — یہ تیرا دم ہے وہ اعجازِ عیسوی تاثیر
تو وہ ہے حامیِ دنیا و دیں زمانے میں — کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر
جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت — صحیح جیسے کہ قرآں ہو مع تفسیر
پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلعِ روشن — کہ جس کا مطلعِ خورشید بھی نہ ہووے نظیر
شہنشاہ وہ تری روشنی رائے منیر — عقولِ عشرہ کے انوار جس کے عشرِ عشیر

بہ ہو نہ تابعِ امر قضا و ردِ وا فی الامر — تو عقل کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر
جو ہیں نکات و معانی بشر کے فہم سے دور — وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر
اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظے میں تو یہ — نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اور کی تقصیر
ابو ظفر شہ والا گہر بہادر شاہ — سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر
شہ بلند نگہ شہریار والا جاہ — خدیو مہر کلہ خسرو سپہر سریر
نہ ہے ثنا کے لئے تیری اختتام و تمام — نہ ہے دعا کے لئے تیری انتہا و اخیر
مگر یہ ذوق ثنا سنج و مدح خواں تیرا — غلام پیر کہن سال اک فقیر حقیر
کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ — سنا ہے جب سے کہ رحم خدا دعائے فقیر
عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیوم — بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر
تن قوی و مزاج صحیح و عمر طویل — سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

## قصیدۂ سودا در منقبت حضرت مہدی امام آخر الزماں

جوں غنچہ آسماں سے مجھے بہر عرض حال — دی سو زباں دہن میں ولیکن سبھی ہیں لال
ہرگز کسی گرہ کے لیے جز خراش دل — مارا نہ آسماں نے کبھو ناخن ہلال
اجرائے کار بند ہے عالم کا اس کے ہاتھ — جز چشم عاشقاں کہ ہیں جاری بالاتصال
رکھتا ہے پر غرور کو جوں نیزہ سربلند — جوں جادہ خاکسار کو شے ہے زمیں پہ ڈال
روشن ہے شمع کشتہ کے پھر سر جلانے سے — یعنی کہ بعد مرگ بھی آرام ہے محال

ہر روز نعمتوں سے کرے سفلے کو غنی  محتاج نان شب ہو سدا صاحب کمال

پارے کو دے ہے رتبۂ اکسیر بعد مرگ  دولت کبھی کسو کو نہ دی اُن نے بے زوال

گر پاسے موختن نہ رہے اُن کے درمیاں  ہرگز کرے نہ شمع کا پروانے سے وصال

سو پردے میں رکھے بوئے گل کو یہ بدتمیز  پھاڑے نقاب رخ پہ حیا کی یہ بدخصال

ڈھانپے ہے جانماز تلے زاہدوں کا عیب  دیتا ہے راز عشق کو پردے سے یہ نکال

ہم پر سدا رکھے ہے گل رنگ کو حرام  خون بہار تیغ خزاں پر کرے حلال

ہر روز اُٹھ کے غنچۂ گل کو کرے ہے تنگ  ہر شب رکھے ہے خاطر بلبل کو پُر ملال

اے دل عزمن کسی کو نہ دے جین آسماں  شکوہ نہ کر تو اس سے کہ ناحق ہے یہ جدال

حاصل نہ ہوسوائے مشقت کے اور کچھ  آہن کو سرد کوٹے گر تا ہزار سال

ہم لست فطرتوں پہ چلی کب تیغ چرخ  دوڑے اُدھر ہی آب جدھر ہو نشیب ڈھال

گر ہو شعور اس سے نہ چاہیں کشاد کار  اس مطلع دوم کو پڑھیں حسب حال

گردوں سے کار بستہ کھلے کیونکہ ہے محال  ہرگز نہیں ہے عقدہ کشا ناخن ہلال

بس کیا ضرور تھا جو کیا شکوۂ سپہر  اے دل تو ہرزہ گوئی سے اپنی زباں سنبھال

خواہش ہے دو جہاں کی اگر تو زباں سے  جز مدح شاہِ ستر و علن مت سخن نکال

مہدی ہادی وہ کہ گر اُس کا نہ ہو دے حفظ  مرکز کو خاک کے تو قوی ہے یہ احتمال

کھل جائے سب میں کی گرہ آپ ہی اکھی  لے شرق تا بغرب جنوب اور تا شمال

یمن قدم سے اُس کے جہاں میں خوشی کے تھے  زائل ہوئی ہے اس قدر اب صورت ملال

ممکن نہیں کہ رات کو شاخ درخت پر — رکھتا ہو مرغ سر کے تئیں اپنے زیر بال
اُس کا قدم نہ ہو وے جہاں کے جو درمیاں — کب چار عنصروں میں رہے حدّ اعتدال
جو کچھ لکھوں میں اس کی سخاوت میں ہے بجا — یہ مطلع حضور مری بات پر ہے دال

## قصیدہ میر تقی میر در منقبت حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتضیٰ

اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال — اب تک ہے دشمنی میں مری میرا بال بال
میں مر گیا فراق میں پر اب یہ کیا ہے ظلم — جیتی گڑے ہے ساتھ مرے حسرت وصال
جنبش ہوئی مژدہ کو ادہر گڑ گئی سناں — ابرو ہلے ترے کہ ادھر کٹ گیا ہلال
آتا ہے یاد قیس بہت اب کہ ہوں بتنگ — اُس کے بھلا دے مجھ کو چھوٹے نہیں غزال
دوزخ ہے میری شرم گنہ سے عرق میں غرق — لیکن نہیں ہنوز مجھے تک بھی انفعال
خوش قامتی کو آہ کی کب پہنچتا ہے سرو — ہے یہ تو باغ رنگ شکستہ کا تو نہال
یک روز بے نقاب ہوا تھا تو صبح کو — اب تک ہے آفتاب جہاں تاب پر زوال
تھے سیر تیرے کوچے میں عشاق کی معاش — کتنے شکستہ دل تھے بہت تھے خراب حال
جتنے غرض تھے سب کو یقیں تھا کہ مر چکے — کوئی نہ تھا کہ جس کو ہو جینے کا احتمال
کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر — اے طبع رہ نہ اتنی بھی پابند خط و خال
پڑھ منقبت نہ شاہ کی جس سے نجات ہو — وہ شاہ جس کے ایک گدا کو یہ ہے کمال
بخشش سے جس کی حرف طلب محو ہو گیا — کم اُس کے وقت میں ہے بہت نوبت سوال

ہے صحن اُس کے مطبخ عالی کا کاسہ لیس — دستار خوان کا اس کے ہے حاتم اک مثال
کہتا ہوں اب میں مطلع ثانی کہ ہوں تنگ — وسعت رکھے ہے بسکہ یہ میدان قیل و قال

اے نائب مناب داد بے ہمال — دے مشورت شریک خداوند لایزال
تو ہے کہ تیرے عدل کے نظم و نسق کو سُن — اٹھ جائے دفعۃً ہی مزاجوں سے اختلال
میلان طبع مطلع ثالث کی اور ہے — تاخیر بر قصیدۂ غرّا کا ہو مآل
لائق تری صفت کے صفت میری ہے محال — آشفتہ طبع شاعر خستہ کی کیا مجال
تو وہ در مدینۂ علم علیم ہے — جس شخص کو نہ آوے الف بے تے دال ذال
آوے تری جناب مقدس میں ایک دم — کرتے ہیں واں تو وقف سبھی طرز کے مقال
عالم ہو اس قدر کہ بیاں کیا کرے کوئی — پھر بحث اُس سے عقل فلاطوں پہ ہے دال
لیتے ہیں تیرے گھر سے گدا پوست تخت فقر — پاتے ہیں تیرے در سے شہا مکنت و جلال
جب تک جیوں میں دل میں مرے آرزو یہ ہے — ہوں سر سے تیرے زائر درگہ کا پائمال
پھر بعد مرگ حوض پہ کوثر کے یا علی — جا گہ ہو میری حشر میں تیری صف نعال
جب تک جئے گا محو ثنا ہی رہے گا میر — ہے تیری منقبت سے نپٹ اس کو اشتغال

## قصیدہ سودا در مدح نواب وزیر الممالک آصف الدولہ

سودا یہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام — لائے گھر اُس طبیب کے ہے عقل جس کا نام
احوال اُس کا دیکھ کے کہنے لگا طبیب — اب فصد و مسہل اس کے لئے ہے مفید تام

کہنے لگا سن اس کو وہ دیوانہ در جواب — مجھ میں لہو کہاں یہ ترا ہے خیال خام
جو کچھ کہ میرے تن میں لہو تھا سو اب کی سال — عامل نے خیرآباد کے پی کر کیا تمام
مسہل طلب کیے ہے غذا کی زیادتی — مجھکو سو ماہ عید بھی گزرا مہ صیام
کیا سودا اس علاج سے کہ اس کے ماسوا — تا اپنی میں دوا کروں اب کے قرض دام
تب اُن نے یوں کہا کہ بتاؤں میں وہ علاج — اس درد سے تو پا کے شفا ہو جو شاد کام
اُس کے حضور عرض کر جس کے سائے میں — مور ضعیف پیل سے لے اپنا انتقام
سنتے ہی یہ نوید قصیدہ برائے نذر — لے کر اب اس جناب میں حاضر ہوا غلام
اے وہ کہ تیرے عدل کی نسبت بخاص و عام — نوشیرواں یہ عدل کا گویا ہے اتہام
دیتا ہے تیرے عدل میں لے عادل نہاں — زخم جگر کو سودۂ الماس التیام
کیا کیا ہی خوبیوں سے کیا جن نے تجھکو خلق — ابنائے روزگار کے لئے فخر و احترام
مذکور حلم کا میں کروں با بیان خلق — یا میں تری شجاعت و ہمت سے اب کلام
تیغ سخا بھی ایسی ہے جس سے بملک دل — پاتے ہیں گڑھ غموں کے بیک ساعت انہدام
بلغ جہاں میں آج تو وہ نخل سبز ہے — پہنچی ہے چار فصل ثمر تجھ سے دم و شام
میں نقش باد پا کی ترے شکل کیا کہوں — بچہ تو حور کا ہے ولیکن فرس بنام
اعدائے بد خصال کی تنبیہ کے لئے — اُس برق دش کی پشت پہ تیرا ہو جب قیام
ہو طرقوں کناں ترا اقبال پیش پیش — نصرت کرے جلو تری اور فتح اہتمام
کچھ کم نہیں جہاں میں سلیماں سے تیرا جاہ — گو السنہ پہ آصف دولہ ہے تیرا نام

تو وہ وزیر ہے کہ حیراں ہو رہیں　　شاہان عصر دیکھ کے تیرا یہ احتشام
مطبخ کا ایک خرچ ترے گر بیاں کروں　　اُس ذکر کو کفاف نہ ہو صد زباں بکام
فیض اُس کا عام اس قدر ہے جو سن کے ہیں پڑیں　　خوانِ کرم پہ اپنے وہ دیں ہیں صلائے عام
تجھ سے کوئی مدح و ثنا مجھ سے ہو سکے　　میں کیا ہوں کیا زباں مری اور کیا مرا کلام
اس نظم سے غرض ہے مجھے عرض مدعا　　مقصد مرا قلیل ہے پہنچے بالفصرام
اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے　　کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام

## قصیدہ میر تقی میرؔ در منقبت حضرت علی مرتضیٰ رضؓ

غنچے ہُو دل پہ آتے ہیں اندوہ اب مدام　　پہنچے ہے مجکو داغ گل جنگ صبح و شام
اے کج روش تو نامہ نہ لکھ نہ بھیج مت پیام　　قاصد میرے سیدھی طرح سے تو لے سلام
دل میں نہیں ہے قطرۂ خوں آنکھیں ہیں گی تر　　خالی پڑا ہے شیشۂ مے بھر رہے ہیں جام
ناکامیوں سے کام رکھا میں تمام عمر　　گو کام دل حصول نہ ہو مجکو کیا ہی کام
اے رشک ماہ عید نہ کر انتظار کش　　مکھڑا دکھا دے چاند سا ٹک آ کے پشت بام
زنجیر پا ہے اُس کی تری زلف غالباً　　مدت ہوئی نسیم نہیں کرتی ابتسام
چلتا ہے تو تو جاتے ہیں کتنوں کے جی چلے　　آ اب کس کو مان کے موقوف کر خرام
آوارگی دل ہی کی آسودگی کو چھوڑ　　ناموس عاقبت کو اُڑا کیسا ننگ و نام
گر جانتا مژہ کو تری تیغ کیں تو میں　　دو چار جانیں اور بھی کر لاتا قرض دام

رونے کا تار باندھو تفرّج نہیں ہے خوب — ہے آنسوؤں کا سلک گہر کا سا انتظام
اک دم تری گلی میں گیا تھا میں سیر کو — لبریز ہوئے خون سے ہے اب تک مرا مشام
صیاد نے اسیر کیا مجھکو پر عبث — میں ٹک جیا نہ فرط تپیدن سے زیر دام
آنکھوں سے اُسکی چشم وفا میر ہے غلط — وحشی ہیں یہ غزال نہ ہوں گے کسی کے رام
چشم طمع کو سی لے ہُما تو کہ جیتے جی — سرمہ ہوئے ہیں بسکہ الم سے میرے عظام
اے طبع اتنی زہرہ سرائی جرس کی طرز — اس گفتگو کا فائدہ۔ کر حاصل کلام
یعنی امیر شاہ نجف کی صفت پہ آ — وہ شاہ جس پہ سارے کمالات ہیں تمام
شاہا ترے گدا کا ہے مشہور احتشام — شاہان سرفراز سب اُس کے ہیں پئے نام
عصفور کس شمار میں پر تیرے عدل سے — گنتی نہیں ہے باز شکاری کی اعتصام
تو ہے کہ تجکو ذات خدا سے ہے ربط خاص — تو ہے کہ ساری خلق پہ تیرا ہے فیض عام
تو ہے کہ تیرے مہر کے سائے میں روز حشر — محفوظ آفتاب قیامت سے ہوں انام
ہیں سہل تیری چشم کے آگے خرابیاں — مشکل یہ ہے کہ ہووے فلک کا نہ انہدام
چاہے اگر تو یہ کہ نہ رو پوش ہووے روز — تہ کر کے شب اٹھا ہی رکھے پردۂ ظلام
گرمی کرے تنک (ذرا) بھی اعانت تری تو پھر — آجائے پختگی پہ مرا پھر خیال خام
یعنی کہ دیکھوں نہ حضرت دہلی کی جا نواح — معلوم ہے سوائے ترے حاصل کلام

ہرگز نہ ہو حلال عدو پر ترے خوشی
ہو وے تمام تیرے محبّوں پہ غم حرام

# قصیدۂ سودا در مدح محمد شاہ عالم بہادر شاہ غازی

ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب ۔۔۔ رخشندگی ذرہ ہے از فیض آفتاب
یک تخم ہوں میں خاک نشین زمین شور ۔۔۔ نشو و نما دے مجھکو کرم کا ترے سحاب
ہے یہ جہاں میں در دولت سرا کہ یاں ۔۔۔ ناکام مجھ سا آن کے ہوتا ہے کامیاب
قطرہ تجھ ابر فیض کا پہنچے جو سوئے بحر ۔۔۔ جائے رگڑ نے چرخ کو موج در خوش آب
دریا کو سیر کشتی سے تیری یہ ہو شرف ۔۔۔ لائے عجب نہیں جو ہما بیضۂ حباب
روشن دلوں کو گر نہ ہو سجدہ در ترا ۔۔۔ رکھے نشان سجدہ جبیں پر نہ ماہتاب
معراج وہ نبی کی جو ہو عرش کے پرے ۔۔۔ معراج اُمت اس میں جو اس جا ہو بار یاب
یہ عدل ہے ترا کہ قوی کو ضعیف پر ۔۔۔ کرنے سے اب تعدی کے آتا ہی اجتناب
کنجشک کے چلے نہ وہ تیر آشیاں تلک ۔۔۔ پر گیری میں لگایئے جس کے پر عقاب
پہنچا نہ تیرے عہد مبارک میں ایک وز ۔۔۔ از دست محتسب کوئی تا پائے احتساب
ہیبت سے کانپتی ہے مناہی اب سقدر ۔۔۔ ہو جائے کیا عجب عرق بید گر شراب
سامان تیرا رازی ہے بہر سر عدد ۔۔۔ تیری وہ تیغ قبضہ ہو جس کا سیاتاب
کیا تاب ہے عدو کی جو ٹھہرے ترے حضور ۔۔۔ سن کر نہیب قہر کو تیرے گہ عتاب
ہر پرت پرت کوہ کا یوں اُڑ چلے کہ جوں ۔۔۔ کھل جائے باد تند سے شیرازۂ کتاب
اُس رخش برق کے ترے وصف میں شہا ۔۔۔ میں نے کیا ہے مطلع روشن یہ انتخاب

رنوں میں اُس کے سورہ سیماب مضطرب — پالاک ترخیال سے وہ دست ناب
گُلوں بھی اُس کے ذرے یہ سخن بجا — گوتی ہے بام جس کے عزت بازفلاب
ملک وہ عنان کشیدہ تو اُس بزم خرام — ہے امر دو صبا کو کہ بوسہ دے بر رکاب
بخشی جو تجھ کو حق نے جوانی میں سلطنت — شیر بازمانہ کو یہ تجھ کی نوامیش شباب
نزدیک شام کچھ یہ شفق پھولتی نہیں — کرتا ہے چرخ پیر حنا باندھ کر خضاب
اُس بارگہ کو کیوں نہ فلک مرتبہ کہوں — جس کی بلند کا کہکشاں ہے بھی یہ طناب
استادہ ہونے میں ہے یہ کچھ اُس کی عظمت و شاں — اٹھتا ہے جس طرح شفق رنگ یہ سحاب
رفعت ہر ایک چوب کی یہ ترخیال سے — نولے میں قطرہ وہم کے آتے یہ نیا حساب
برج حمل کی مرج سے بیٹھے کے بیچ تخت — تو اس میں ایوان شرف کے ہوا جوں تخت شمس
اُس تخت پر بمسند اقبال بیٹھ کر — کرتا ہے تو نشاد ان نور دولے جناب

# قصیدہ ذوق

یہ قصیدہ ابوظفر بہادر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔ شمس العلما آزاد نے اس کی شان تصنیف میں جو کچھ لکھا ہے یہاں بحرفہ نقل کیا جاتا ہے:۔

اُستاد مرحوم (ذوق) جشن کی مبارک باد کے لئے کئی دن سے قصیدہ مرقوم الذیل لکھ رہے تھے۔ بعد شام صاف کرنے بیٹھے کہ صبح دربار میں پڑھیں گے چند شعر لکھے تھے جو مرزا علی عرض بیگی کا آدمی آیا اور کہا مرزا صاحب نے آداب

عرض کیا ہے۔ (اور آہستہ سے کہا) اسی وقت بیگم صاحب (بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارت سلطنت اُن کے نام کر دی تھی) کا حکم پہنچا ہے کہ کل اُستاد قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی اُن کے شعروں پر تعریف نہ کرے۔ آپ کو خیال رہے۔ اُستاد نے کہا بہت خوب، میری طرف سے انھیں دُعا کہنا۔ وہ شخص رخصت ہوا۔ آپ تھوڑی دیر سوچتے رہے اور ایک دم گرم ہو کر کہا۔ اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے؟ خدائی کا منہ بند کرتی ہے؟ میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوانِ خاص کے در و دیوار سے واہ واہ لوں گا۔ یہ کہا اور پھر لکھنے لگے۔ رات کے ڈیڑھ بجے تک قصیدہ صاف کر لیا۔

صبح کو دربار میں حاضر ہوئے وقت معین پر ایما ہوا کہ اُستاد اپنا قصیدہ عرض کریں انھوں نے پڑھنا شروع کیا مگر دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود۔ کئی شعر پڑھ گئے سب صم و بکم۔ جب ساتواں شعر پڑھا تو بادشاہ نے ارشاد کیا آگے آؤ۔ اور آگے آؤ۔ پاس پہنچے تو اشارہ کیا سر جھکاؤ اور ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا۔ پھر کہا ہوں (یعنی پھر پڑھو) پھر تو جو پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے۔ خوب تعریفیں ہوئیں۔ بیگم نے بھی سُنا کلیجہ مسوس کر رہ گئیں ——

یہ قصیدہ ۱۲۴۹ھ میں لکھا تھا۔

پیری میں پُر ضرر ہے جامِ شرابِ ناب  
یا بے فروغ صبح نہ بے نورِ آفتاب

تا ئبہ نہ ہو تو اس سے کہ ڈاڑھی ہوئی سفید  
کر خوب مے کشی کہ یہ ہے سیرِ ماہتاب

ہے بیر دل کی خنک کی ہوا پہ بجائے عمر — یہ برف وہ نہیں ہے جسے زور تم عذاب
ہستی کا اپنے کر نہ بھروسا حباب دار — تعمیر بے بنا ہے اور یہ خیمہ بے طناب
آئی ہے جب سے قالب خاکی میں تیری جاں — غافل سپے سفر ہے اسی دن سے پا در رکاب
جو دم مزے سے گزرے غنیمت سمجھ کہ روز — گردش ہے آسماں کو زمانے کو انقلاب
ہر بازی فلک پہ تو نرد و نرد و نرد کر — رکھ آفتاب گنجفہ پر سال کا حساب
حاصل ہے کیا ہنر سے ولا آئینے کو دیکھ — جوہر سے دل میں کھاتا ہے کس درجہ پیچ و تاب
گر ہو سکے تو خاک در میکدہ ہو تو — اس خاکداں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب
آسودگان گنج خرابات سے کے لیے — جانا بہشت تک بھی ہے دوزخ کا اک عذاب
یاں تک ہیں بے دماغ نہ بولیں گے منہ سے وہ — دیں گے جواب نامہ نکیرین کو جواب
رکھتا ہے چرخ اہل سعادت کو بد مذاق — گزران ہے ہما کی سر روزی کباب
دیکھے جہاں کو دیدۂ عبرت سے تو گر — جام جہاں نما ہے ہر اک کا سہ حباب
ساقی جو تجھ کو عین عنایت سے جام دے — لے اور لگا کے آنکھوں سے پی جا اسے شتاب
گر بے حساب جام پہ جام آئیں تیرے ہاتھ — روز حساب تک تو پیے جا علی الحساب
مستی میں ایسا مطلع تازہ کوئی سنا — جامی میں بھی لکھے دل پر جسے کر کے انتخاب
گلشن کو شے جو یہ گریۂ مستانہ تیر آب — بیضوں سے بلبلوں کے ہو پیدا بط شراب
بے ہوشیوں میں ہیں وہ مری گرم جوشیاں — ہوتے ہیں جس سے طائر ہوش خرد کباب
جاگ اٹھیں وہ جو خواب عدم میں ہیں ہوشمند — غفلت میں گر بلند ہو میری خواب

پرہیز میرا یہ ہے کہ تقوے سے ہے گریز — تقویٰ ہے میرا یہ کہ ہے توبہ سے اجتناب
لیکن ہے ابر رحمت ایزدی سے دُرفشاں — داماں تر مرا زروشش دامن سحاب
مدح ہوں میں اس کا کہ ہے جس کے دور میں — شیب زمانہ کے یہ کیفیت شباب
اُس شاہ کے ہم کرم و بوئے خلق سے — ہر خار بُن ہو ہمسر فوارۂ گلاب
وہ بادشاہ جس کا بہادر شہ اسم پاک — ہے در حجب زمانہ کا یکتا دُرِ خوش آب
ظلّ الٰہ خسرو دیں دار دین پناہ — شاہ بلند جاہ و خدیو فلک جناب
گنج خلق اُس کی طبع رواں میں نہیں فدا — دریائے موج زن کو ہزاروں میں پیچ و تاب
پڑھتا ہوں میں وہ مطلع روشن حضور میں — جس کا نہ ہووے مطلع خورشید بھی جواب
شاہا تو وہ ہے نور مجسم کہ آفتاب — کرتا ہے نور کو ترے سائے سے اکتساب
کرتا ہے یوں ثنا کہ دعا پر اب اختصار — یارب دعائے ذوق ہو مقبول مستجاب
تا عید عیدگاہ ہو اور خطبہ و نماز — تا خطبہ و نماز سے منظور ہو ثواب
ہر سال تجکو عید ہو فرّخ بعزّ و جاہ — ناکام ہوں عدو ترے اور دوست کامیاب

## قصیدہ سودا مدح نواب آصف الدولہ

کیا قلم کو قسم سے ہے منظور — کہ صریر اُس کے سے ہے دل مسرور
نور صبح بہار کا نبذ پر — خط خطِ گلعذار کا دستور
زلف خوبان چیں سے خوبی میں — کھینچے ہر سطر جس کی آب کو دُور

بے تبسم قسم کے منہ پر شق
قلم اپنی قسم سے ہے مسرور

خامہ بیش از گیاہ کیا ہے جسے
ہو قلم سے یہ خوش دلی کا وفور

مگر اس امر پیچ کرتا ہے
اس ظرف انتہا ذہن شعور

کہ لکھا چاہتا ہے اس کی مدت
خلق میں جس کی خلقت ہے مشہور

یعنی نواب آصف الدولہ
جو سلیمان پہنچے جس تک مور

ہے توان بخش ناتواں کا وہ
شاد اس کا ہے متفق جمہور

لے گیا پیل پیل کو پشہ
اس کے آگے کیا جو باہم زور

شعلہ شمشیر اور جب دم اس کی تیغ
ہو وے خاک سے یہ ندم میں فتور

اوس کی بخشش کا وصف کیا کیجئے
سخت اور نرم پر یہ ہے دستور

سخت پر جیسے نار صابن میں
نرم پر جوں ہوا میں بال طیور

یہ دہن اس کی باندھے جو کر
دہن سے جو سینے مظفر و منصور

مح غائب ست دل ہے اپنا تنگ
ہو نہ لے خامہ باریاب حضور

وہ جو تیری کمان کی سیسر ہے
کس کو اس کے اٹھانے کا مقدور

وصف خوبی میں باد پا کی ترے
کرتی ہے اب زبان برق قصور

ہے فرس کس کے زیر ران ایسا
جس کے جلوے کا ہووے یہ مذکور

گرد سے پل میں تمام روئے زمیں
سینہ بار نقش لعل ستور

اگر ایسی جو نیر سے زخمی کی
جس کا پروردہ نمک ہے فرور

دیکھ اس پر سے تجھے یہ بولی خلق — ہے تجلّی حق بکوہِ طور
فتنۂ دہر میں نسق سے ترے — کوئی ہو وے ممد کیا مقدور
خس و آتش ہو جس جگہ واں سے — راہ جیب کردہ جائے باد سحور
تانک وے غزال دیدۂ شاہیا — پھر نظر دیکھے گر سوے عصفور
گرم آتش پہ تجھ غضب کی نگاہ — ہو حرارت کا اُس میں بھی یہ وفور
زندگی کے لئے سمندر بھی — جا ہے مسکن پہ معدن کافور
تیری فیض نگاہ کو پرکاہ — پہونچ کر جا سہے نہ ہو مغرور
کوہ ہو جائے شکل شیشہ کے — گر کے نظروں سے تیری چکنا چور
تو وہ دریائے فیض ہے جس سے — واہمہ کرسکے کبھو نہ عبور
تیری بخشش ہے یہ کہ گوہر سے — جوں صدف مشت خلق ہے معمور
مطلب نظم سے ترے آ گے — کچھ خوشامد مجھے نہیں منظور
بسکہ ہے لائق تنا یہ جناب — مدح کرنی ہوئی مجھے بھی ضرور
میری ہی اعتقاد ہے یہ مدح — ورنہ رتبہ ترا ہے اتنا دُور
کہ جو چلے ہے خیال داں جائے — پہونچنے کا اُسے کہاں مقدور
ختم سودا کرے سخن بدعا — آمین سب بولیں بندگان حضور

فضل سے حق کے تو بہ حشمت وجاہ
رہے تا حشر خرم و مسرور

# قصیدہ نعتیہ از شمس العلما خواجہ الطاف حسین حاؔلی

میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور — مجھ سے اُٹھیں گے اُن کے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پہ ہے دماغ — مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور
خاکساری پہ کوئی میری نہ جائے — میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنو اہلِ عصر میں مجھ کو — میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
چشمۂ آبِ خضر کے مانند — چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت — مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثلِ یوسف دکھائے جوہرِ ذات — جس کو بکنا ہو مفت یہاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر — ہوں زمانے کے ہاتھ سے مجبور
کبک و قمری رخصتِ پرواز — بال و پر مفتِ صعوہ و عصفور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں — اُس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور
لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ — اس کو کیا قدرِ خوشۂ انگور
جس کے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے — روزِ روشن ہے یا شبِ دیجور
پہلے ہو گی کسی کو قدرِ ہنر — اُٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور
دردِ دل کا بیاں کروں کس سے — بات کوئی نہیں مجھے منظور
سخنِ حق کی داد لوں کس سے — سن چکا ہوں فسانۂ منصور
دلِ آباد مفت بے ہنراں — ہو چکا خانۂ ہنر معمور

مژدہ خسرو کو وصل شیریں کا / ہو مبلی سعی کوہکن مشکور
ہم نے دیکھی تمیز اہل نظر / ہم نے دیکھا مذاق اہل شعور
ہے غرض ان کو صحبت موزوں سے / نازکی دل ہو یا نوائے طیور
ہو کسی شے سے ان کی گرمی بزم / داستاں ہو وہ یا کہ درس زبور
ہے فقط روشنی سے ان کو کام / موم ہو اصل شمع یا کافور
ہے یہاں قائل انا مردود / ہو وہ فرعون وقت یا منصور
آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ / دل اصحاب گو نہ ہو مسرور
یہاں اگر کام ہے تو شیریں سے / قصر خسرو کے اور ہیں مزدور
دل احباب پر نہیں ہیبت / سحر میرا اگر رہے غیر سے دور
ہوں تماشائے شہر نابینا / ہے برابر مرا خفا و ظہور
در یکتا ہوں اور ہوں بے آب / ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور
چشمہ بیداد کا رواں تشنہ / بادہ پر زور و انجمن مخمور
اس زمانے میں وہ عزیز کہاں / جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور
صاحب قدر و جاہ ہے جب تک / کار فرما ہے چین میں فغفور
کاش اس عہد میں مجھے پاتے / تھا سخن جبکہ قبلۂ جمہور
کاش واں دیکھتے مجھے کہ جہاں / متنبی تھا مادح کافور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز / انوری ہے نہ عرفی و شاپور

کون دیکھے مرے چمن کی بہار　　مر گیا عندلیب نیشاپور
جس سے ہوتا ہے خستہ سینہ ہوش　　ہے زباں میری وہ دم ساطور
جس سے ہوتا ہے کور پروانہ　　ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور
شرح نقطہ کی گر کروں تحریر　　تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور
ترک عشق بتاں کریں عشاق　　مجھ سے سن پائیں گر ستائش حور
گر کروں ذکر لذت طاعات　　تیح کر دوں مذاق فسق و فجور
چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد　　دل خسرو میں ڈال دوں ناسور
کر نے جاؤں جو حق سے عذر گناہ　　لے کے آؤں نوید عفو قصور
لوں ملائک سے داد حسن کلام　　گر لکھوں نعت سرور جمہور
وہ شہنشاہ امتی جس کا　　یہاں گنہگار اور وہاں مغفور
وہ خداوند خدمتی جس کا　　یہاں سبکسار اور وہاں ماجور
مژدہ ملے امت ضعیف کیلئے　　سعی ہوتی ہے بے کئے مشکور
لب شیریں کلام سے اس کے　　دوست بھی شاد غیر بھی مسرور
اثر فیض عام سے اس کے　　کعبہ آباد و میکدہ معمور
چرخ کو دے اگر وہ حکم سکوں　　ہو غلط نسخۂ سنین و شہور
سر سر قہر گر چلے اس کی　　بند ہو مسلک صبا و دبور
جس طرف ہو وہ گرم نظارہ　　جلوہ گر ہو ادھر سے لمعۂ نور

ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن — موجزن ہو وہاں سے چشمۂ نور
بات پوچھو تو سوے چرخ نگار — سینہ دیکھو تو علم کا گنجور
ہو سکے اُس کے خوبیوں کا شمار — نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
اے ترا پایہ فہم سے برتر — اے ترا نام عرش پر مسطور
میں تو سے درِ بخشش کے آیا ہوں — نام تیرا شفیعِ روزِ نشور
کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے — مگر امید عفوِ ربِ غفور
طبع غالب ہے اور میں مغلوب — نفس قاہر ہے اور میں مقہور
بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق — نشۂ کبریا میں ہوں بالکل چور
چھوڑ لی تو ہی نہیں خودی امن — ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور
بہر فرزند خواہشِ زر و سیم — طمع جاہ و فکرِ عیش سرور
ایک بیمار اور سو آزار — ایک رنجور اور سو ناسور
نفس آمادہ اور دیو مرید — یہ ہے افعی تو وہ ہے کلب عقور
مجھ سے جو کام چاہیے لیجئے — جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور
حسد و بغض و غیبت بہتان — بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور
ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی — ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور
دل لگے بندگی میں کیا امکاں — لب رہے ذکرِ حق میں کیا مقدور
مایۂ عقل ہے نہ شور جنوں — دل بیتاب ہے نہ جان صبور

نہ معاصی میں تلخیٔ خجلت　　نہ عبادت میں چاشنیٔ حضور
فی الشل ہے مری مسلمانی　　جیسے زنگی کا نام ہو کافور
ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے　　تیرے زمرے میں گر ہوا محشور
جب ترے کارواں میں جا پہنچا　　پھر رہا باب خلد کتنی دور
دور ری آستان والا ہے　　ہے تنگ حالی مجبور
اب دعا یہ ہے لے شفیع امم　　بسکہ بے تاب ہے دل رنجور
جا لگے تیرے در پہ کشتی عمر　　جب کروں بحر زندگی سے عبور
جیتے جی دل پہ یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

---

اس قصیدے کی تمہید ۱۲۷۷ھ یا ۱۲۸۸ھ کے بیانات میں سے ہے یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن۔ ذوق۔ آزردہ۔ غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے انھیں دنوں میں سیتا رام کی بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں۔ جن دوستوں کی جا بیجا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار مشاعرے میں نہ آئے۔ جیوا اپنے خریدار کی بے التفاتی

سے ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعر اُن لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدردان سمجھتا ہے۔ اُسی خام خیالی کی جوش میں اس قصیدہ کی مخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیوں کہ اس زمانہ کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ لہٰذا قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا۔ تاکہ فخر کے لئے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔ ۲؎

---

## قصیدۂ سوؔدا در منقبت حضرت امام موسیٰ رضا

اگر عدم سے نہ ہوساتھ فکر روزی کا — تو آب و دانہ کو لے کر گھر نہ ہو پیدا

نہیں میں طالب رزق آسمان کہ مجھے — یقین ہے کاسہ و اتدوں میں کچھ نہیں ہوتا

نکل وطن سے ہے غربت میں نہ دیکھیئے — کہ آب بجت ہے جب تک ہے تاک میں صہبا

ہنر کو مفلسی ہرگز نہیں ضرر کہ کہیں — چنار کو تہی دستی سے نقص جوہر کا

بلند ہمت اگر ہوں نہ زیر چرخ ضعیف — ہلال عید ہو عالم کا کیوں کہ روزہ کشا

فتادگی میں یہ عزت ہے دیکھ اے سرکش — کہ نیک و بد نے کیا نقش پا کو راہ نما

نہ ہو سکیں مرے اشکوں کی سد رہ طوفاں — بگڑ نہ رکھ سکے خاناں کا دامن یار
نکوئی جو کرے دنیا میں ہووے وہ پامال — بسان جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا
جہاں کے باغ میں جوں شاخ بے ثمر ہے تے — کسی کی دوستی سے نفع جز ضرر نہ لیا
مرے سخن کی مرے بعد زیادہ ہووے قدر — گہر یتیم جو ہووے تو ہو فزوں بہا
نہیں ہے کام مجھے شعر و شاعری سے دلے — خرد نے مجھ کو نصائح سے یا بہا یہ کہا
زباں پہ لا سخن خوب تو نہ رکھ دل میں — کہ اس گہر کی نہیں قدر جو صدف میں رہا
برنگ فلس سبکسار بحر دنیا میں تو رہ — کہ موج حوادث نہ ڈبوے تجھ کو بہا
کسی کی دل شکنی سے جو خوش کرے دل کو — وہ کون لوگ ہیں کیسے ہیں کیا ہیں مجھ کو بتا
یقیں تو جان گیا ٹوٹ دل مرا دو ہیں — جو خاو مجھ کے مرے پاؤں میں نہ ٹوٹا
ہنر کی اپنے مکافات نفع گردوں سے — طلب نہ کر کہ ہوا ایک بام پر دو ہوا
غرض میں دیکھ کے یہ تنگ چشمی گردوں — شب گزشتہ اسی فکر بیچ مرتا تھا
کدھر کو جاؤں میں تا دل کرے مرا ارشاد — ذہن خیال میں قدسی کا یہ سخن گزرا
مے بہ بزم حریفاں شگفتہ شو چوں قدر — کہ جاں بر لے تو دارد در آتش جیا
یہ سن کے مژدۂ جاں بخش میکدے کی طرف — چلا میں گھر سے نپٹ خوش ہو یہ غزل پڑھتا
غرض کہ میکدے آیا شغف سے اتنے میں — بتان چشم میں جوں سمائے نشۂ صہبا
لے نگاہ جو کرتا ہوں میکدے کی طرف — گئے حواس مرے مجھ سے دیکھتے ہی جو کیا
کہ مست چاک گریباں جام چشم پر آب — ہے آہ و نالہ میں نے گریہ در گلو مینا

یہ حالِ دیکھ کے دل کا خرد سے پوچھا میں — جگہ طرب کی میں آیا ہوں یا کہ جائے عزا
دیا جواب خرد نے کہ اے نادان — خوشی ہے دہر میں یہ غم سے پوچھتا ہی کیا
نہیں ہے امن کہیں زیرِ آسماں ہرگز — بجز زمیں خراساں کہ ہے وہ عرش آسا

## قصیدہ سحرؔ لکھنوی

تمام ہند کی تھا جان لکھنؤ اپنا — ہمارا خسروِ جم جاہ جانِ عالم تھا
جہاں ہے قالب بیجان کسی میں جاں نہیں — فراق موت سے بدتر ہے اُس مسیحا کا
اگر ہزار برس کھائے گا فلک گردش — پھر اس صفات کا ہوگا نہ آدمی پیدا
یہ مومنوں سے طبیعت میں خاکساری تھی — وہ مہر تھا کہ در بوتراب کا ذرا
مصاحبوں میں تھے سب لکھنؤ کے چیدہ لوگ — ہر ایک شہرۂ آفاق و شاعر عزا
ہر ایک رشک ابوالفضل و فیضی و عرفی — نہ ہوگا اکبر اوّل کا نورتن ایسا
عجب مجمع اہلِ کمال تھا افسوس — ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا
نہ چوتھی کا کہیں جلسہ نہ تیجے کی صحبت — جہاں میں شادی و غم دونوں کا مزا نہ رہا
نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ دوریان گجر — نہ توپ چلتی ہے اب ہے غضب کا سناٹا
جہاں ہیں صاحبِ جوہر کی ہے یہ بے قدری — ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا
صفائی شہر کی ہے صاف صاف کہتے ہیں — کہ دروتوں کے ہیں پتلے یہ سب ہے نقشا
یہ انتہا کی صفائی ہوئی ہے گلیوں کی — کہ لکھنؤ میں کسی کا قدم نہیں جمتا

بھٹکتے پھرتے ہیں گم کردہ کارواں کی طرح     وہی تھے ہم جو خضر کو بتاتے تھے رستا
جنھوں نے راہِ شریعت میں پاؤں رکھا تھا     لیا انھوں نے تو بیٹھے ہی بیٹھے کا رستا
مکان سینکڑوں سڑکوں نے کر دیے مسمار     تمام شہر کا کچھ اور ہو گیا نقشا
کسی کا گھر گیا پشتہ کہیں گری دیوار     چبوترہ کہیں خانہ کسی کا دروازا
وہ کوٹھیوں میں محل بیگمات کوروں میں     وہ جھگے رہیں کی پیری کا تخت پرانا
پکارتا تھا یہی رند ساقیا یہ خبر     بگیر جام کہ ابر بہار آ پہنچا
غضب ہے یا تو وہ میلے تھے یا یہ ویرانہ     مقام ہو کا ہے کوئی نظر نہیں آتا
یہ شہر وہ تھا پرستان اسی کو کہتے تھے     جو قصر تھا وہ اکھاڑا تھا راجہ اندر کا
اُجاڑ اب یہ پرستان بے سلیماں ہے     کہیں فراق نصیبوں کی ہو قبول دعا
خوشی ہو عید کی نکلے کہیں وہ عید کا چاند     دوبارہ رفتے ہمایوں کا پھر ہو نقارا
صدا وہ ڈنکے کی کانوں سے پھر سنیں یارب     علیم جلالی کی تو ہیں خدا کرے ایسا
سڑک پہ بادِ بہاری چمک کے پھر نکلے     شگفتہ غنچۂ دل ہوں بہار دے بیلا
ہر ایک کوچے میں میلا اسی طرح پھر ہو     خدا سے زور کسی کا نہیں سوائے دعا
مقام عجز ہے دم مارنے کی جا نہیں     جو کچھ فلک نے دکھایا وہ آنکھوں سے دیکھا
خدا ہی جانے نظر کس کی لگ گئی ایسی     ہنسنے بھی پاتے نہ تھے ہنسے جو قہر رنجا
زمیں پاؤں کے نیچے سے نکلی جاتی ہے     کمر سفر پہ بندھی ہے قدم نہیں جمتا
رئیسِ شہر تو سب اپنے اپنے حال میں ہیں     نہیں ہے آج کوئی اپنا روکنے والا

نہیں مقصود کسی کو یہ خوبیِ اعمال
مقام شکر ہے لازم نہیں گلہ شکوا

تحریر شعر پڑھے دل دکھادیا تم نے
ہوا آ گئے سننے کی تاب نہیں برائے خدا

کوئی قصیدہ رنگیں پڑھو کہ جی بہلے
وہ نذر دو اُسے جس کا ہو مرتبہ اعلا

جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی
وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہنچا

تماشا صنعت کا اب کھیلتے ہیں بردانہ
کہ جنگل آدمیوں کا یہ سب ہے گویا

یہ حکم ہے کہ نہ ہو جاوے اس جگہ باہم
وہ دن گئے شب ورد زرمت تھا ایسا

عجیب باغ تھا رشکِ بہشت قیصر باغ
ہر اک درخت تھا میوے کا غیرتِ طوبا

نہال قطروں سے تبسم کے موتیوں سے سفید
عقیق سرخ کے گل تھے زمرّدیں سبزا

چمن لطیف لطیف آبِ جو نظیف نفیس
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور وادی گلگشت

وہ لال لال گل سرخ و لالۂ حمرا
وہ زرد زرد نرگس ہرا ہرا سبزا

ہوا کے جھونکوں میں بے شبہ جان آتی تھی
حقیقۃً دمِ عیسیٰ تھی اُس چمن کی ہوا

فلک پہ دانۂ انجم سے پھوٹتی تھی کرن
بہارِ گل میں جہاں چاند کہت کرتا تھا

لگا کے دانتوں سے مسواک ہنک دیتے تھے
چمن کے خاک سے ہوتا تھا موتیا پیدا

پڑا جب اُٹھ کے رخ صاف پر غبار چمن
بنفشہ خطِ رخ خال سے ہوا پیدا

صدائے نغمہ سے گونجا ہوا تھا سارا باغ
ہر ایک شاخ سے آتی تھی بانسری کی صدا

غزل سرائی بلبل صدائے تتہ وہ گل
شکست تو یہ زہاد دو قلقل مینا

صدائے سازِ نوازئے مغنی و مطرب
وہ کوک کوئلوں کی وہ نوا پپیہوں کا

عجیب رنگ کا میلا تھا وہ نئے ایجاد ‏ ‏ گلے میں کس کے نہ تھا گیر دانیا جوڑا
غرض فقیر سے تا بادشاہ سب یک رنگ ‏ ‏ روش روش پہ نئی صحبتیں نیا جلسا
وہ کون ہے؟ کہ جناب منور الدولہ ‏ ‏ وزیر ایسا نہ آگے ہوا نہ اب ہوگا
برب کعبہ خوشامد سے میں نہیں کہتا ‏ ‏ زمانے کا ہے یہی قول ایک مجھ پہ کیا
امیر و ابن امیر و وزیر و ابن وزیر ‏ ‏ محبّ شیعہ و زوار سید الشہدا
صفائے قلب سے یکساں ہے ظاہر و باطن ‏ ‏ غبار و زنگ سے ہے پاک آئینہ دل کا
زیادہ کیجیے تعریف جس قدر کم ہے ‏ ‏ کہ ایک ذات میں لاکھوں صفات ہیں بخدا
غریب پروری و عدل گستری و کرم ‏ ‏ مخیری و عنایات میں کہوں کیا کیا
فروتنی و تواضع و انکساری و عجز ‏ ‏ بقدر دانی و جوہر شناسی یکتا
بس اب عنان کمیت قلم سے تحریر کو ‏ ‏ سمند طبع تو منہ زور ہے نہیں رکتا
زمین شعر میں ہر چند ہے بڑی وسعت ‏ ‏ مگر دعا پہ کرو خاتمہ قصیدے کا
جہاں میں جب تلک اسپ فلک پھرے یارب ‏ ‏ ہے دست رعد میں جب تک کہ برق کا کوڑا
ہے نیزہ دار فلک کا بھی نام تا روشن ‏ ‏ بھرے نہ ابلق ایام جب تلک کا وا
سوار اسپ صفا میں جو ہے مرا ممدوح ‏ ‏ الٰہی اس پہ ہو سایہ سوار دلدل کا

## قصیدۂ انشا در مدح شاہزادہ سلیمان شکوہ

صبح دم میں نے جو لی بستر گل پر کروٹ ‏ ‏ جنبش باد بہاری سے گئی آنکھ اچٹ

دیکھتا کیا ہوں سرہانے ہے کھڑی ایک پری    جس کے جوبن سے ٹپکتی ہے نری گدراہٹ
آفتاب اُس کے جبیں کے جو مقابل ہووے    صدقے صدقے ہو کہے اُف ری تری چمکاہٹ
موتیوں سے جو بھری مانگ وہ دیکھے اُسکی    سیر سے تاروں بھری رات کی جی جانے ہٹ
حرکت اسکی تھی یوں غمزۂ چالاک کے ساتھ    رند جوں اینڈ کے مے خانے میں یوں کی ڈوٹ
شوخی اُس در سے اُس تار نظر میں کھیلے    آتا جاتا ہو رسن پر کوئی جس طرح سے نٹ
قامت ایسی کہ قیامت بھی کرے جس کو سلام    اُس کے اٹھلاتے ہوئے چلنے کی سُن کر آہٹ
شور محشر کو یہ کہ بیٹھے خرام اُس کا مانٔ    دال ہے عین لیے دو رہے ہو چل ہٹ
نشہ میں قلقل مینا سے یہ فرما اُٹھے    کیا خوش آتی ہے صدا مجھکو تری غٹ غٹ
سرو و شمشاد و صنوبر سے کہے چلتے ہو    کھیلنے جاتے ہیں ہم آج چمن میں جھرمٹ
کچھ نہ گہنا نہ جواہر نہ تکلف نہ بناؤ    سادگی اپنے سے مسرور خوشی سے غٹ پٹ
الغرض تھی جو ان اوصاف سے موصوف اُس نے    اپنے مکھڑے سے دوپٹے کے مسلسل کو اُلٹ
مجھ سے سرکہہ ہو گیا دولت بیدار ہو میں    خواب غفلت سے بس اب چونک گلے میرے لپٹ
مجلس آراستہ ہے سال گرہ کی اُس کی    جس کی ہر لحظہ دعا دینے میں ہے سب کو رٹ
یعنی وہ شاہ سلیماں کہ شکوہ اُس کے سے    نیر حشمت و اقبال کو ہے چمکاہٹ
جشن شاہانہ ہے اور ہیں اُمرا حاضر وقت    اُس کے مجرے کو کھڑے فوج کے ہیں غٹ کے غٹ
بزم ایسی ہی مرتب ہے، کہ سبحان اللہ    جس میں اقسام تماشا کا ہوا ہے جمگھٹ
واسطے نذر کے کر تو بھی قصیدہ کوئی عرض    اٹھ کمر باندھ بھی جلد چلا چل جھٹ پٹ

سنتے ہی میں نے یہ دولت سے خوشی کا مژدہ — شرف اندوز ہوا خدمت اقدس میں جھٹ

بارہا محفل شاہانہ میں مطلع وہ پڑھا — جس کی سطوت سے ہوئی جان عدو کی تلپٹ

عازم جنگ ہو جس لحظہ تو گلگوں کو ڈپٹ — گاؤ سر بھینک کے جھٹ سام سا بھاگے چھوٹ

ختم کرتا ہے دعا شیہ ان شاء اللہ — یارب اس در پہ ہو عالم کی خوشی کی آہٹ

صحت و جشن و نشاط و طرب و دولت کا — حسب دلخواہ ہے ذات سے تیری جمگھٹ

خوبی و خرمی و راحت و آرام و سرور — تیرے دروازے کی تا حشر نہ چھوڑیں چوکھٹ

## قصیدہ امیر مینائی در مدح نواب کلب علیخاں والی رامپور

تا کجا کوتہی اے دست ہوس کر جھوٹ — پردۂ شرم رخ شاہد معنی سے اُلٹ

جیتنا ہو جو سواران سخن سے میداں — پھینکنا چاہیے رہوار قلم کو سرپٹ

یہی گو ہے یہی میداں یہی معنی یہی لفظ — اپنی اپنی ہے دم معرکہ یہ ڈانٹ ڈپٹ

پی چکے گو کہ مے صاف کو اگلے مے نوش — رہ گئی ساغر و مینا و سبو میں تلچھٹ

خم میں میخانے میں ایسے بھی کہ ڈھونڈے نہیں مہر — کھول منہ بھر کے صراحی کو لے پی جا غٹ

وہ قصیدے جو ہیں مصحفی و انشا کے — واقعی سکۂ رائج ہیں ولیکن ملپٹ

سخت پتھر سے جو تھے قافیۂ نامانوس — کچھ بھی کاٹا نہ گئی تیغ زباں اُسکی اچٹ

فائدہ ہے تو فقط گرمی و جیب کی کا — برفصاحت سے یہ کہتے ہیں کہ حق بہ زہو بیٹھا

ہمت فکر نے باندھی جو کمر بہر جواب — اوّل اوّل تو طبیعت کو ہوئی گھبراہٹ

آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا　　کر لیا تازہ مضامیں کا علاقہ کورٹ
لو سنو گوش توجہ سے ذرا نظم فصیح　　وہ ہے صاف نہیں نام کو جس میں لچھپٹ
شب دوشنبہ جو لی خواب میں یہ نے کروٹ　　آئی اک حور لقا پاس الٹ کر گھونگھٹ
کچھ عجب فتنہ گر اسکی تو نظر جس نے الٹ　　ساتھ ہی چرخ چھرے لے یہ زمانہ گردٹ
شعلہ رخسار جفا کار قیامت آفت　　شوخ عیار غضب قہر چھلاوا نٹ کھٹ
رحم دکھلانے جو منہ دور سے پھر جائے نگاہ　　شرم آجائے تو آنکھیں کہیں چلی دو ریوٹ
گر پڑے جان پہ زیور کی چمک سے بجلی　　کھینچ لے دل کو وہ پوشاک میں خوشبو کی لپٹ
وہ نگاہیں غضب ابرو وہ دم مژگاں کی صفیں　　لشکر صبر جنہیں دیکھ کے کھائے گھونگھٹ
لے کے انجم کا جو لشکر اتر آئے مریخ　　کھینچ کر تیغ ادا جیت لے میدان جھٹ پٹ
پختہ کا اسکو جو دیکھیں طمع خام کریں وہ　　تر پیش رس حسن میں وہ گدراہٹ
طرفہ چہرے کی لطافت وہ سنہری رنگت　　دست افشار طلا سے بھی سوا زماہٹ
آپ ہی چھیڑ کرے آپ ہی پھر حد سے بڑھے　　توسن ناز کو یوں دے وہ پٹینگے سرپٹ
مستی حسن سے گردن میں کبھی ڈال دے ہاتھ　　بے چھوئے گاہ لجالو کی طرح جائے سمٹ
پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشارے سے کبھی　　ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ
مانگ لے مانگ دکھا کر کبھی عشاق کا دل　　باندھ لے گاہ گلا گھول کے وہ لفظ کی لٹ
شیخ گیسو پہ مرے اتنے مسلماں ہندو　　مقبرے ہو گئے تعمیر ہرے سب مرگھٹ
فتنۂ حشر کو دیکھے تو کہے زلف سے آنکھ　　لا جھپٹنے میں اسے دیر نہ کر دوڑ جھپٹ

طاق کا بل وہ پھنکتی کہ سر کی کوئی چوٹ — رو کے لے مڑ گئے تو وہ جھک گئے لگاتے پالٹ

ہاتھ چھو جائے جو گیسو کو تو کھائے یوں پیچ — جس طرح کاٹ کے کاتا کوئی جاتا ہے نیٹ

دیکھ کر ابرو ئے پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں — پہلواں وہ ہیں کہ کشتی ہیں جو ہیں ایک ہی بیٹ

جلوۂ گر مردم وحشم وصفِ مژگاں میں نہ تھا — حور بیٹھی ہے در خانہ یہ کھولے ہوئے پٹ

کھ گرا نکھ کہے آنکھیں ہیں نرگس کی پھٹی — وہن غنچہ نہ دے منہ کو ہے غنچۂ منہ پھٹ

چوری چوری چمن رخ میں جب آجائے نگاہ — زلف مشکیں کی پھن اینٹھ کے مشکیں جھپٹ

وصف لکھے لب شیریں کا جو کوئی کاتب — صفحے سے صفحہ ندوبت کے سبب جائے لپٹ

آرزو مہر کو مشرق سے نکل کر ہر صبح — کہیں جو شن کی طرح جاؤں میں بانہ سے لپٹ

غرض اس شکل کی معشوقہ کیا جس کا بیاں — نظر آئی تو عجب جی کو ہوئی الجھا مٹ

شوق دل نے یہ کہا مست ہی یہ سر بھی — عشق پیچے کی طرح جائیے مستی میں لپٹ

ہاتھ دامن پہ پڑا تھا کہ وہ پیچھے سرکی — سر قدم تک بھی نہ پہنچا کہ گئی دور وہ ہٹ

چوٹ سی دل پہ لگی ہاتھ گیا جب خالی — تازیانے سے نہیں کم وہ پڑی تیغ جو ہٹ

ہنس کے ظاہر میں کہا واہ ری ٹھنڈی گرمی — آپ ہی لطف و کرم آپ ہی یہ جھنجھلاہٹ

چپ رہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد — تھی ملاقات کہاں کی کہ یہ تیزی جھٹ پٹ

ہوش میں آؤ ذرا خیر ہے کیسا ہے مزاج — خفقان سے تو طبیعت میں نہیں گھبراہٹ

میں وہ ہوں جس کی ہوس میں ہیں ہزاروں ناجی — سینکڑوں مر گئے تھی جن کو مرے نام کی رٹ

مرغ دل سیکڑوں شہباز نظر کے ہیں شکار — خال وہ زاغ سیہ ہے کہ کلیجے کی چٹ

ہند سے روم تلک جتنے کہ ہیں شہزادے
صبح تا شام ہے اُن کا مرے در پر جمگھٹ

پاؤں کنوؤں کے گھسے مشل ہیولیٰ سر پیچڑے
بادۂ وصل کی پائی نہ کسی نے تلچھٹ

ناطقہ خانۂ دولت ہے مرا نام معنت
میں یکتا ہوں تو مکاں جائے زرو سیم پٹ

ملہم غیب نے بھیجا تو میں آئی ترے پاس
ہو گراں تجھ کو جو آنا ابھی جاؤں میں پلٹ

وصلت تو کرتا ہے جس کا میں اسی کی ہوں مصنفت
دیکھو اعضا کو ذرا پردۂ غفلت کو اُلٹ

دائے انور سے اسی کی مری آنکھوں میں نور
خلق اس کا مرے گیسو میں ہے خوشبو کی لپٹ

صفِ مژگاں سے عیاں پنجۂ برزدر کی شکل
عزم اُس کا مری شاہیں نگہ کی ہے جھپٹ

اُس کی جو ہستی طبع وہی قد میرا
دامنِ فیض کا لشکا مری زلف کا لٹ

مصحفِ رُخ کو جو دیکھو تو نمایاں ہی شان
کعبۂ دل کو جو دیکھو تو اُسی کی چوکھٹ

کون وہ کلب علی خانِ بہادر جم وجاہ
دیتے ہیں جس کو ملک عالم بالا کی رٹ

عالم خلق نے تحصیل کی خوشبو کی لپٹ
کر لیا سارے گلستاں کو علاقہ کو رٹ

کیا شگفتہ ہے بہارِ چمنِ نزہت طبع
سامنے جس کے گل ولالہ میں گنڈا کر کٹ

واہ کیا قصرِ حکومت ہے رفیع او وسیع
جس کے دروازے کے ہیں جزاۓ بہشت وپٹ

شیخ سید مغل افغان ہیں فراہم سرِ صبح
کعبہ ان چار معلقوں سے ہے اُس کی چوکھٹ

لیلۃ القدر رکھو اب نام قصیدے کا اثیر
کہہ یہ خامے کہ مصروف دعا ہو جھٹ پٹ

ملک ودولت کی ترقی ہو الٰہی ہر روز
سجدہ گہ سالمۓ زمانے کی بنے یہ چوکھٹ

حل ہوں مہد فتح کے ہاتھوں سے مہمات جہاں
در دولت پہ رہے اہل غرض کا جمگھٹ

نفسِ چند جو باقی ہوں مری زیست کے بھی — انھیں قدموں کے تلے جائیں بڑے لطف سے کٹ

## قصیدہ انشا در حمد

اے خداوند مہ و مہر و ثریا و شفق — لمعۂ نور سے تیرے ہے جہاں کو رونق
بیٹھ کر مکتب ابداع میں تو نے کھولے — دفعتہً نسخۂ افلاک کے جو سات ورق
تذکرہ پھر تو ہوا مسئلۂ وحدت کا — عقل اوّل نے پڑھا تجھ سے مہذب ہو سبق
ذات کی کنہ کو کیا فہم کریں گے اوہام — سکڑوں نوع کے ہیں جس میں خلائق مخلوق
کیجیے گر نظر غور بانواع صفات — خیرہ ہو ذہن کہ ہے یہ مسائل ہیں ادق
روح کو حکم تعلق بجسد فرمایا — تاکہ اشکال ہیولا و صور ہوں مشتق
خلق انساں کو کیا نامیہ اس کو بخشی — ہیأت جسم کو کر کے متشکل بہ علق
جلد دی لحم کو تصویروں کو تا نمازیہ ہے — ایک پردے میں تو آ اخذ کریں اپنا حق
ہیں سب اعضا و شرائین و رباط اعلیٰ تا — روح کی آمد و شد کو نہ ہے رنج و فرق
واسطے فائدے کے سب یہ بنائے اعضا — عانق و کتف و ید و ساعد و رسغ و مرفق
سمع و ذوق و بصر و لمس و شم و وہم و خیال — بن کہے تو نے دیئے مجھکو کریم مطلق
صدقے اس بندہ نوازی کے تری ہم جاویں — باپ ماں ہوتے ہیں کب ایسے شفیق و مشفق
تیرے سطوت کے جو ادنیٰ کو نظر بھر دیکھے — توسن وہم کو یک بارگی آجائے عرق
بحر مواج حقائق سے گزر کون سکے — ہاں مگر فضل ہے تیرا ہی بجائے زورق

داورا ہیچ کہ سزاوار پرستش تو ہے | بے شک و شبہ سمعنا و اطعنا الحق
روز و شب حضرت خلاق ترے حکم میں ہیں | عرش و لوح و قلم و شش جہت و ہفت طبق
ہے موالیدِ ثلاثہ کو علی قدر الحال | تیرے ہی فضل سے محصول سلاسۂ رزق
لطف فرما جو ترا ظلِ ہمایوں ہو تک | چشم تحقیر سے عنقا کی طرف دیکھے لق
سیکڑوں طرح کی خلقت کو تو اے رازق کل | بھیجتا نعمت الوان ہے بے طشت و طبق
حمد کے بعد یہ شکریہ ادا کرتا ہوں | شکر صد شکر ہے اے حمد و ثنا کے الیق
کہ مجھے دین محمدؐ میں کیا تو نے خلق | ورنہ تھے اور بھی انواع کے ادیان و فرق
شرِّ وسواس شیاطیں سے بچا لے مجکو | تیرے سایے میں چھپا آ کے ہوں اے رب فلق
نہ تو کچھ دین سے بہرہ نہ مجھے دنیا سے | سن لے اس بندۂ آشفتہ کی بھی اے مرے حق
وسعتِ رزق تفضل ہو مجھے صحت ساتھ | جلد ایسی کہ نہ کرنی پڑے مجکو زق زق

## قصیدۂ ذوق در مدح ابوظفر بہادر شاہ بتقریب عید رمضان

ایک خورشید لقا طرفہ جوانِ ارشق[1] | تابِ رخسار فلک[2] سرخیِ رخسار شفق
وہ جبیں ماہ جبیں اس پہ خط بیں جبیں | تھی وہ انگشت بنی جس نے کیا ماہ کو شق
کرے دو ٹکڑے جگر کھینچ کے ابروئے تو | باندھ کر کھینچ کے دل زلف مسلسل کی دق[3]
تیر سے انداز جو مژگاں تو ادا دشنہ گزار | چشم ابلق تو نگہ ترک سوار ابلق

---

۱ تیز نظر ۲ روشن ۳ زنجیر۔

غمزہ و ناز و کرشمہ وہ بلا غارت گر  کہ نہ چھوڑیں تن عشاق میں جاں ایک رمق
سرو قامت سمن اندام گلستاں رخسار  ہونٹ گلبرگ دہن غنچہ و بینی زنبق
سرو قامت سے اگر اُس کے ہو طوبیٰ ہمسر  راست ہاں راست ہے یہ ٹھ طویل احمق
شکر آمیختہ بادام مقشّر دنداں  سیب فردوس زنخداں لب خنداں فستق
کھلنا اس کے دہن تنگ کا ایسا مشکل  جیسے دشوار ہو مفہوم کلام مغلق
مصحفِ رو سے کتابی کو جو دیکھوں اُس کے  تو کہیں صورت اخلاص نہ یاد مطلق
لوح رنگیں سے نہ زیبا ہو بیاض گردن  تا کہ ہو سرخی شنجرف نہ خونِ ناحق
دست بازو و بر و دوش عجب صبح بہا  پنجہ وہ پنجۂ خورشید و حنا رنگ شفق
سینہ تا ناف صفا آب گہر کا دریا  ناف اک عکس ذقن اُس میں بجائے زورق
نازک اس کی کمر ایسی کہ سمجھنا مشکل  جس طرح شعر خیالی میں ہو معنی ادق
ہے گراں اُس پہ نزاکت نہ باندھے ہرگز  گر ہو تابِ نظر دیدۂ عنصتا سنطق
آگے بالیں پہ وہ طناز سراپا انداز  مجھ سے یہ کہنے لگا کیوں ہے تو غمگیں ناحق
مژدۂ عید سے ہے گلشن عالم میں بہا  نغمۂ عیش سے ہے بزم جہاں میں رونق
دوش پہ سرو لب جو کے ہے اک سبز قبا  بر میں لالے کے بھی گلشن میں ہے گلگوں ابلق
جوش سبزہ سے ہے وہ فرش سر صحن چمن  کوئی مخمل اسے کہتا ہے کوئی استبرق
باغ عالم میں ہے یہ جوش بہار عشرت  ٹپکے ہے نخل سے مستی میں ہمیشہ راوق

---

۱ پستہ ۲ ٹپکا ۳ قبا ۴ شراب۔

تو بھی کر تہنیتِ عید کا اُس کے ساماں
کہ وہ ہے خسروِ دیں حامیِ دینِ برحق

وہ بہادر شہِ غازی کہ دمِ معرکہ ہوں
اُس کے تیروں کے ہدف اُس کے جنودِ بے دیں

مدح اس کی ہے مناسب تجھے بلکہ انسب
یعنی توصیف کے لائق ہے وہ بلکہ الیق

سن کے میں نے یہ کہا مدح میں اس کے مطلع
جس پہ احسنت کہیں مجکو لبید و عمعق

تو ہے وہ نائبِ ختمِ رسل اے سایۂ حق
کہ ترے سائے میں ہے گلشنِ دیں کو رونق

ابرِ رحمت کا ہے سایہ ترا اے سایۂ حق
کیوں کہ سائے میں ترے ہو نہ جہاں کو رونق

کس کا مقدور کہ سرتاب ترے حکم سے ہو
جو ترا امر ہے الحق جو کہے تو صدق

ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر اس طرح
تاکہ ہوں ارض و سما دونوں طبق زیرِ طبق

ہووے ہر سال مبارک تجھے عیدِ رمضاں
اور دشمن کو ہے تیرے سدا رنج و قلق

## قصیدہ سحرؔ لکھنوی در مدح نواب مصلح سلطان وزیر دولہ

رند و بہار آگئی بیتا ہوئی خزاں
جنا بھی جاموں کی سڑک پر ہوئی رواں

سرسبز عیش باغ ہوا دل ہرے ہوئے
ہونے لگے نکھار جہاں دیکھیے وہاں

سنتے ہیں موتی جھیل میں پانی بھی آگیا
تیراکیاں بھی ہونے لگیں پھر امتحاں

کیا کیا ہوئے ہیں سرو قد دیکھ بدن ہرے
جھپٹے ہیں نور تن نہ اترتی ہیں ڈنڈیاں

ہر کوچے میں بہار نئی سادگی کی ہے
کیا کیا درخت بیچتے پھرتے ہیں باغباں

کیا باغ عیش باغ ہے بے شک بہشت ہے
جائے کبھی بہار نہ آئے کبھی خزاں

بلبل کو وصلِ گل ہے تو قمری کو وصلِ سرو
صیاد ہے چمن میں نہ گل چیں نہ باغباں

ٹیلا ہر ایک طور ہے مشتاقِ وصل کو
ابرِ بہار آتش کے بڑاوے کا ہے دھواں

اب تو بقول حضرتِ سودا یہ رنگ ہے
ٹہنے جو زرد تھے وہ ہوئے شاخِ زعفراں

پھرتے ہیں مست باغ میں ہر دل باغ باغ ہے
ہر ایک سرو قد کی بغل میں ہے بوستاں

یہ باغ سبز دہ ہے دکھاؤں ہوں جو واعظو
تم کیا کرو دوڑے آئیں تمہارے فرشتے خاں

نشو و نمائے رنگ چمن میں جما لیا
دیوارِ باغ ہو گئیں مہندی کی ٹٹیاں

شفاف کوہ و دشت ہیں آئینے کی طرح
چھا ہوا بھی زمیں پہ گگن گو سب آسماں

واعظ کی ریش تک تو ہے رنگیں خضاب سے
دھوکے کی ٹٹیاں بھی ہیں مہندی کی ٹٹیاں

ابرِ چمن نے سارے گناہوں کو دھو دیا
مجرم نہ مے پرست نہ گل چیں نہ باغباں

پرسانِ حال کون ہو کس سے کہے کوئی
صیاد کے ستم نہیں قابلِ بیاں

کس قفس میں پھنسایا ہو کس عندلیب کو
کس قفس میں اجاڑ کے پھینکا ہے آشیاں

چھوٹے غلاف ہیں قفسوں پر بہار میں
کیا کیا حجاب ہیں گل و بلبل کے درمیاں

نیرنگیِ جہاں نے دکھایا ہے زرد رنگ
صحبت کسی کی دیکھ نہیں سکتا آسماں

کچھ اس بہار میں بھی وحشت زیادہ ہے
سینے میں دل ہے یوسفِ گم کردہ کارواں

تم کو بہارِ باغ مبارک ہو بلبلو
اب شعر خوانیاں وہ کہاں اب سحر کہاں

اپنی فقط بہار تھی جنت مکاں تلک
ہر روز جاتی تھیں گل معمون کی ڈالیاں

رہنا ہو لکھنؤ میں جسے جائے عیش باغ
تکلیف سیر ہم کو نہ دیں یارِ مہرباں

ہر گام پر صدا جرس دل ہے یہی — کچھ خبر ہے یہ دشت کہاں تم یہاں کہاں

چھوڑو نہ لکھنؤ کو خدا کے لیے پھرو — دو دن کی زندگی نہ کرو مفت رائیگاں

بہلاؤ جی کو لوگوں میں سب آدمی ہو — اپنی بھی تم کو قدر نہیں فخر شاعراں

رہتے ہو زیر سایہ نواب نامدار — اُن سے زیادہ کون ہو صاحب کا قدرداں

ہمسائگی کے شعراء عرفا حقوق ہیں — اُس پہ یہ طرّہ ہے کہ قدیمی ہو شرح خواں

صاحب تمہارا اور عریضہ پڑا رہے — چاہو تو دستخط ہوں ابھی لا کے عرضیاں

ایسا امیر ابن امیر اور کون ہے — مردم شناس صاحب اخلاق نکتہ داں

شاہ اودھ نے مصلح سلطاں یا خطاب — کرسی وہ دی کہ پست ہو مہر آسماں

سارا قصیدہ ہے نئے انداز میں تمام — عرضی کی احتیاج نہیں بہر نکتہ داں

فردوسی زماں ہو حقیقت میں سحر — دھوئی دھلائی کوثر جنت کی ہے زباں

موقوف اس کا لطف ہے اپنی زبان پر — تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

## قصیدہ منیر شکوہ آبادی

## در تہنیت ولادت نبیرۂ نواب کلب علیخاں والی رام پور

ہوتا ہے ماہ عید جو افلاک پر عیاں — ہوتے ہیں پیر فرط محبت سے نوجواں

ظلمات شب کے جانے سے ہوتی ہے کیا خوشی — ذرّے جو دیکھ لیتے ہیں خورشید آسماں

اللہ رے بلبلوں کو گل تازہ کا مژدہ
جاتا ہے باغ دہر سے جب موسم خزاں

دولت ملے تو ہوتی ہے محتاج کو خوشی
طبع مریض ہوتی ہے صحت سے شادماں

قدر نشاط پوچھئے ایسے فقیر سے
مل جائے جس کو سلطنت شہر ناگہاں

کہیے وہ کس زباں سے شکر خدا کرے
آب حیات پا کے جو زندہ ہو نیم جاں

آفت سے جو کشتی طوفاں رسیدہ کی
کیوں خوش نہ ہو ملے جو اسے ساحل اماں

کیوں کر وہ کشت خشک خوشی سے ہری نہ ہو
دامن میں جس کے ابر کرم ہو گہر فشاں

جلتا ہو دھوپ میں جو مسافر میان راہ
ظل ہما کے پانے سے کیوں ہو نہ شادماں

یہ سب نشاط عیش فدا اس سرور پر
فضل خدا سے سب کو جو حاصل ہوا یہاں

پوتا دیا خدا نے خداوند عہد کو
قائم عصر قبلۂ عالم خدایگاں

مسند نشین کشور انصاف و عدل و داد
فرماں رواے دین و دول حامی جہاں

علم و عمل میں بے بدل افضال میں وحید
بے مثل ہر کمال میں کامل کے قدرداں

عزت فزاے اردو تازی و فارسی
لاریب فیہ مفخر ہر صاحب زماں

وہ ناخداے کشتی اسلام ہند میں
نواب پاک کلب علی خاں شہ زماں

حاصل ہوا جو یہ گل نوبادۂ مراد
ہیں شکر باغبان حقیقی سے تر زباں

ہے آج رام پور میں طوفان آب زر
کشتی گدا کی سونے کے پانی میں ہے رواں

جس سمت دیکھو عید مبارک کی دھوم ہے
گھر گھر میں آج ہے ابدی عیش میہماں

اللہ رے فیض خسرو دریا نوال سا
لٹتا ہے آج چار طرف گنج شائگاں

یہ چاہتی ہے خدمتِ مولودِ پاک میں ہو دائگی سے مادرِ ایام کامراں
مارے خوشی کے پانوں نہ رکھے زمین پر گہوارہ اس کا ٹھہرے اگر مہدِ آسماں
پہرا ہوا ہے عیش کا دیتی ہیں رات دن چاروں طرف کھڑی جو لئے ڈوریاں
آبِ حیات سے ہے سوادیوں کا دودھ عمرِ خضر ہے فضلِ الٰہی سے پاسپاں
ہر سمت بول بالا اسلام کا ہوا جس وقت اس کے گوش مبارک میں دی اذاں
نام خدا یہ جب سے ہوا زینتِ کنار آغوشِ مرضعہ ہے در قصرِ خسرواں
ہے دھوم اس کی دہر میں شان اس کی ہے بلند کیوں کرتے افتخار کریں نوبت و نشاں
بسم اللہ اس کی جلد دکھائے مجھے خدا فضل و کمال علم سے ہو جائے کامراں
کرتا ہے یہ قصیدہ دعا پر تنیر ختم اے خالقِ زمانہ و روزی دہِ جہاں
طفلانِ انجم اوجِ فلک پر ہیں تا کہیں جب تک ہی جوئے شیرِ سحر خلق میں رواں
عمرِ دراز پائے یہ مولود نامور زیبِ کنارِ جد و پدر ہو یہ ہر زماں
بیتیں یہ میں نے شب کو پہر بھر میں نظم کیں تا صبحدم ہوں قابلِ نذرِ خدائگاں
ہر چند نظر خاص کے قابل نہیں مگر کیا دے سوائے اس کے یہ ملخِ مورِ ناتواں

## قصیدۂ ذوق در مدح مرزا محمد ابوظفر بزمانۂ ولیعہدی

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دارالشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر　　شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق　　لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشوو نما
ہو گیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں　　بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو　　برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جو برگ حنا
پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں　　زرد چشم آب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خون　　چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
خام کو اشیا میں نے تلخی رہی نہ سمیت　　بن گئی تریاک افیون زہر میٹھا گیا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم　　کیا عجب گر آب حنظل دیوے شربت کا مزا
نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں　　کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا
راحت و آرام کا اس میں ہے کچھ درد کہ در　　چاہیے واقف نہو دوران سرے آسیا
موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف　　اب رکھے ہے روشنی مثل دل اہل صفا
آگیا اصلاح پر ایسا زمانہ کا مزاج　　تا زباں خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا
نسخہ پہ لکھے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب　　کہتا ہے بیمار میں کر مجکو بالکل ہے شفا
فرق جا ہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے　　درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں جدا
لاغروں کو ہو کہاں تاب و طاقت یہ شتاب　　کیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا
صبح صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آگئی　　لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے دلیں شتہا
بھوک کی شدت سے اس کو یک نفس فرصت نہیں　　قرص سے خورشید کی جب تک کرے نہ ناشتا

رات بھر ٹوبکا گیا انجم کے دانے چرخ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلاً شکم میں کچھ نہ تھا

پہونچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانے میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہنچایا بہم
جیسے الکیموس ہے جو حلق سے اتری غذا

ہے مزاج اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب خطِ استوا

رکھے گا تعویذ گنڈا کوئی کیوں کر اپنے پاس
باغِ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیکھا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو
پھینک دی گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جب کہ ہو اس کی نوید غسلِ صحت جاں فزا

وہ ولی عہد زماں مرزا محمد بو ظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنائے اقویا

تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد
ہو مقوی دل و جاں مثلِ اوراقِ طلا

شادیٔ صحت سے اس کے آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب عجب جرا

میں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں
بلبلِ تصویر سن کر بول اٹھے مرحبا

## مطلع

آج عالم میں وہ روزِ سعادت انتمار
دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو ہو پیدا ہما

مژدۂ جاں بخش صحت ترا ماء الحیات
جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا

ہے بقائے عمر سے تیری بقائے عمر خلق
ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آبِ بقا

قطرہ افشانی سے آب غسل صحت کے ترے
ہوں دُرِ خوش آب پیدا اس قدر قوت فزا

ہو دیں استعمال یا قوتی میں وہ موتی اگر
بخشے پیرانِ کہن کو نوجوانوں کے قوا

جسم کو مل مل کے دھویا تو نے جو دم غسل
گردِ کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا

دل عدوئے سنگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت
زیر پا پامال ہوتا تھا برنگ سنگ پا

خوردۂ دل کو صبا لائی تصدق کے لئے
دے گیا ابر بہاری نذر دُرِ بے بہا

شادیِ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوش عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

چھیڑے تار شمع کو گر ناخن موج نسیم
بزم میں پیدا ہو تار ساز مضطرب کی صدا

لب پہ ساغر کے ہے جوں موجِ تبسم موجِ مے
شور قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے قہقہا

بزم تصویرات فانوس خیالی کی طرح
حلقۂ رقاصگاں ہے زیر گردوں جابجا

کر رہا صحن چمن ہی میں ہے کیا طاؤس رقص
آشیانہ میں ہے رقصاں طائرِ قبلہ نما

خانہ ہائے چشم میں بھی پتلیوں رقص ہے
ہے جو منظور نظر سب کو تماشا رقص کا

چھوٹی آتشبازی ایسی جسکی گلکاری کو دیکھ
رات کو کہتے تھے آپس میں ثریا و سہا

صنع آتشباز پر حیرت زدہ ہوتی ہے عقل
سنگ پارس سے کہیں باروت کو پیسا تھا کیا

ہو گئی تاثیر جس کی یہ کہ ہر گل ریز سے
ریزۂ فولاد نکلے بن کے گلہائے طلا

گنج چھوٹتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے
ماہ یاروں کا تھا گویا خندۂ دنداں نما

منہ ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے ہمتاب ہو
غازہ سے ہر چند چمکے رنگ روئے مہ لقا

بُرج جو اُڑ کر ہوئے قندیل سب زیر فلک
بُرج تھے جتنے فلک پہ سب کو روشن کر دیا

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہو کہ اس کے روبرو جشن جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا
ہے زبان خامہ عاجز آگے بس تعریف میں ذوق کہتا ہے اٹھا کر ذوق میں دست دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شاد مطلق تجھے
جو ترے بد خواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

## قصیدہ در نعت از شیخ امیر اللہ تسلیم

فقر میں نقد بر دیتی ہے لباس اغنیا جسم عریاں پر اتو ہوتا ہے نقش بوریا
خاک میں مل کر بھی ہے مجھ کو خیال خسروی جانتا ہوں مور کے سائے کو میں ظل ہما
منہ نہ دیکھا میری حسرت نے کبھی امید کا آج تک ہے صورت ارمان مفلس پارسا
کچھ تو کم ہو جوش محرومی خدا را اے فلک پھر چندے انقلاب لطف بخت نارسا
فیض ارباب ہمم ہے قوت بے مایگاں کشتی درویش کو دست کرم ہے ناخدا
گھر میں بیٹھا عالم ایجاد کی کرتا ہوں سیر دل مرے پہلو میں ہے آئینہ قدرت نما
میرے اس کے رابطہ ہے صورت مصراع بیت ایک ہے معنی میں دونوں ور بظاہر ہیں جدا
گو اسیر گل ہوں لیکن نکہت گل کی طرح مجھکو سوئے اصل ہے ہر دم کشان جذب ہوا
میرا ہر نالہ دلیل منزل مقصود ہے رہنمائے کارواں ہو صورت بانگ درا
سرسری اے شیخ میری نقش ہستی کو نجان قطرۂ ناچیز ہوں لیکن ہوں دریا آشنا
عشق کامل چاہیے فیض جمال پاک سے رفتہ رفتہ نور ہو جاتا ہے پتلا خاک کا

امتحاں گر چاہتا ہے دیکھ سینے کو مرے  
ہو رہا ہے مشرقِ خورشیدِ مہرِ مصطفےٰ

جس کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ مثلِ روحِ تن  
ہر گھڑی آغوش میں تھا شاہدِ قربِ خدا

طے کئے نہ پردۂ گردوں شبِ معراج میں  
جیسے عینک سے گذر جائے نگاہِ تیز پا

اک ذاتِ پاک تھی کونین میں دل کو عزیز  
فرشیوں کی نور ایماں عرشیوں کی پیشوا

معنی بیتِ دو عالم یوں سمجھنا چاہئے  
تھی خبر ذاتِ مقدس حرفِ کن تھا مبتدا

عین کثرت میں رہی پابندِ وحدت مثلِ شمع  
نور بخشِ بزم تھی اور بزم سے مطلب نہ تھا

ایک توجہ میں دو عالم کی حقیقت کھل گئی  
قلب تھا لوحِ طلسمِ گنجِ اسرارِ خدا

زندگی بخشِ دلِ مردہ تھا ہر حرفِ سخن  
آبِ حیواں تھا دہن لب موجۂ آبِ بقا

سینۂ حاسد سے پوچھا چاہئے اوجِ کمال  
سو جگہ سے چاک ہے جس طرح مفلس کی ردا

واہ ری عظمت کہ خاکِ پا کو راہِ فخر سے  
کھینچتا تھا ہر ملک آنکھوں میں جائے توتیا

اہلِ بینش تھے مگر بینش تھی ہر دم پوشیدہ  
مثلِ دامانِ نگاہِ چشمِ اعمیٰ پارسا

بس کہ فانی ذاتِ حق میں تھے کراماً کاتبین  
دم بخود میں صورتِ تصویر کیا تھا کیا ہوا

بے نیازی کی بدولت حرفِ دولت ہر میں  
ہو گیا ننگِ شنیدن جیسے میرا ماجرا

کیا کہوں ترکِ ادب ہے دل تھا پاکوئی صنم  
جس کے سائے تک پہنچ سکتی تھی حرصِ ہوا

دیکھ کر زہد عبادت سُن کے تسبیح و دُعا  
عالمِ علوی سے آتی تھی صدائے مرحبا

ذرّہ ذرّہ آئینہ تھا آفتابِ حشر کا  
صبحِ عیدِ بہشت جنت اُس کے کوچے کی فضا

ایک ذاتِ پاک تھی موصوف چار اوصاف سے  
خضر پی عیسیٰ نفس موسیٰ سخن یوسف لقا

واہ ری لطف تکلّم وقت ارشاد بیاں — حرف ہو کر لب سے آتا نکتۂ علم خدا
تیغ نے جس دم سے کی تھی سرفروشی اختیار — شوق کے نام زندگی خضر ہستی تھی فنا
کھینچتے تیغ دو دم جس دم میان کارزار — روح کافر باس سے کہتی رضینا بالقضا
سامنے جو آگیا راہی ہوا سوئے عدم — بن گئی شمشیر عریاں جادۂ دشت فنا
ٹھہر اے تسلیم کچھ ترکِ ادب کا پاس کر — خاک تو لکھے گا اوصاف جناب مصطفےٰ
چاہیے ہر دم حضور دل سے یہ کہتا رہے — اے شہ والا حسب صلّ علیٰ صلّ علےٰ

## قصیدۂ ذوقؔ در مدح ابوظفر بہادر شاہ بتقریب جشن سالگرہ

ہے مری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر — ایک گہر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر
نظر خلق سے چھپ سکتے نہیں اہل صفا — تہ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر
رزق تو در خورِ خواہش ہے پہنچتا سب کو — مرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر
پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت — غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر
ہے دل صاف کو عزلت میں بھی گردوں سے غبار — گرد آلود سیہی ہوا تنہا گوہر
کور باطن کو ہو کیا جوہر دانش کی شناخت — کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر
جوہر خوب کو درکار ہے آرائش خوب — خوب تو آب کی خوبی سے ہی ٹھہرا گوہر
ربط نا جنس سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد — ہو نہ ہم صحبت تا رنگ حنا را گوہر
دل خراش اور ہے طاقت وہ دل ہی کچھ اور — کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر

صدق اور کذب پہ ہر نکتے کے ہو شرط نظر — کور کیا جانے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر
صاف باطن کی ہو جب قدر کہ ظاہر ہو درست — مول بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر
ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی — تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر
ذوق موقوف کر انداز غزل خوانی کو — ڈھونڈ اس بحر میں اب کوئی اچھا گوہر
غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر — آگے تقدیر ہے خرمہرہ ملے یا گوہر
اثر مدح سے اس خسرو دریا دل کے — گر سخن قابلِ گوشِ دل دانا گوہر
وہ بہادر شہ غازی کہ برنگ نیساں — روز برسائے ہے ابر کرم اس کا گوہر
جش سے اس کے ہے اک فیض کا دریا جاری — بہتے پھرتے ہیں برنگ کف دریا گوہر
مدح حاضر میں کروں ہیں کوئی مطلع تحریر — آج ہے خامہ مرا منہ سے اگلتا گوہر
آج وہ دن ہے کہ لے خسرو والا گوہر — کو وہ دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر
ہو ترے فیض قدم سے جو زمیں گوہر خیز — ہو نصیب صدف نقش کف پا گوہر
صبح اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا — جو ترے طرۂ دستار کا چمکا گوہر
ماہ گھٹنے کے لئے ہے نہ کہ گھٹنے کے لئے — تیرے کنٹھے کا کہوں کیا اسے زیبا گوہر
آج محفل میں ترے وہ گہر افشانی ہے — لگن شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر
سینۂ صافی کا ترے ایک ہی نقشہ دریا — دل روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر
ہو تری کلک کرم جبکہ تہا گوہر بار — جیم محتاج کے دامن ہیں ہر نقطہ گوہر
خسروا میں جو کہوں سب ترے وصاف نکو — تو سدا منہ سے گرے پھول جھڑیں یا گوہر

ذوق کرتا ہے دعائیہ پہ اب ختم سخن — تاکہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر
تا ہے پنجۂ خورشید ہر روز طلا — تا گرہ میں رکھے شب عقد ثریا گوہر
دانۂ انجم سے گردوں پروئے جب تک — رشتۂ کاہکشاں میں شب یلدا گوہر
ہر برس جشن ترا تجھکو مبارک ہووے — برسیں نیسانِ کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنج گہر روز نصیب
ہو نہ جز اشک سر دامن اعدا گوہر

## قصیدۂ منیر در تہنیت غسل صحت نواب تجمل حسین خاں فرخ آبادی

قلزم فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر — اپنے کوزے میں سئے بھرتے ہیں دریا گوہر
دستگیری ہوئی پامالوں کی کس کو منظور — آبلوں سے ہوئے کس واسطے مانا گوہر
کس خدا دوست کے ہاتھوں میں پہنچنے کے لئے — کرتے ہیں دانۂ تسبیح سے رشتا گوہر
غسل صحت کی خوشی کون ہے فیاض نے کی — کس کے صدقے کے لئے لائے ہیں دریا گوہر
یارب آئی ہے یہ کس کی شب جشن عشرت — آج تاروں کے لٹاتا ہے مسیحا گوہر
محفلِ رقص میں کس نے یہ گہرباری کی — چرخ سے لوٹنے کو آئی ہے زہرا گوہر
وہ فلک مرتبہ نواب نصیر الدولہ — صدفِ قدرتِ حق کا ہے جو یکتا گوہر
دست پُر نور سے سائل کو جو بخشا گوہر — ہو گیا دست گدا میں ید بیضا گوہر
فیض والا سے نہیں اہل عدم بھی محروم — فرط بخشش سے ہوئے بیضۂ عنقا گوہر

آپ کے فیض نے جب ابرِ کرم برسایا — رعد کے بدلے گرجنے لگے کیا کیا گوہر

تیرے دریائے کرم کی نہ ملے گی کبھی تھاہ — آب میں اپنے عبث کھاتے ہیں غوطہ گوہر

تیرا ایسا ہے یہ گھوڑا دمِ رفتار اگر — پھینک دو ڈھال جگہ میں کوئی اچھا گوہر

شش جہت میں یہ فلک سیر پھر آئے جا کر — اک پہلو بھی نہ بدلے ابھی اصلا گوہر

ہاتھی ایسا ہے سبک رو کہ قدم سے جب کے — ڈھونڈتا کیا کہ نہ ہو نام کو میلا گوہر

پانی خرطوم سے پھینکا تو بنا در خوش آب — برسے اس ابرِ سیہ مست سے کیا کیا گوہر

دیکھ کر موتیوں کی جھول یہ سب کہتے ہیں — پہنے پھرتی ہے عروسِ شبِ بلدا گوہر

ختم کرتا ہے دعا پر تری تعریف منیر — ہاتھ آتا نہیں اب نظم کا اچھا گوہر

ابر فیاض رہے جب تک کہ در افشاں ہر آب — قلزمِ دہر میں جب تک کہ ہوں پیدا گوہر

میرے نواب ہمیشہ ہوں صحیح و سالم — مسند آرا رہے تا حشر یہ والا گوہر

عمر و اقبال زیادہ ہو عطا ہو فرزند — روز برسیں در دولت سے خدایا گوہر

اپنے مداح کی اب عرض خداوند سنیں — نذر کے واسطے لایا ہوں میں کیا کیا گوہر

سچ یہ ہے آپ سخن گو بھی سخن فہم بھی ہیں — دیکھئے ان میں سے کوئی نہیں جھوٹا گوہر

منہ میرا گوہرِ انعام سے ہو مالا مال — دہنِ فکر کے ہوں دانت سراپا گوہر

## قصیدۂ مومن در منقبت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

کوئی اس دور میں جئے کیوں کر — ملک الموت ہے ہر ایک بستر

داد خواہوں کے شور سے دیکھو — چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر
آئینے نے بھی اس زمانے میں — تیغ کے سے نکالے ہیں جوہر
آتش لعل شعلۂ جاں سوز — آب نیساں ایک بدگوہر
جس کو دیکھو سومایۂ بیداد — کیا ہوا گر نہیں ہے سیمیں بر
ذکر انساں سے دیو مجنوں ہو — آدمی سے پری کو آئے عذر
ہے پئے اشتیاق ویرانی — شاہ فرہاد بے ستوں کشور
نہ امیروں کو پاسِ بندیِ عدل — نہ رعایا مطیع و فرماں بر
اُس کو ہو رستم زماں کا خطاب — جو کرے قتل خورد سالہ پسر
کمترین خانہ زاد طعنہ زن — طرز حرف ملامت مادر
ہیں گدا اہل عز ور شیر دیہ — بے گنہ جو کیا ہے خون پدر
حین آرا کو رسم پیدائش — اک بہانہ ہے بہر قطع شجر
دشمن جان عاشقان دلدار — گرنگہ تیغ ہے مژہ خنجر
خاص وہ مایۂ دل آشوبی — جس کا بیمار غم نہ ہو جاں بر
وہ جو سر کاٹ کر پشیماں ہو — رحم گر آئے نیم بسمل پر
وہ نہ لی جس نے حال کی میرے — عمداً کیا کہ بھول کر بھی خبر
وہ کہ مومن کی ضد سے مومن ہو — یہ گر اُس کے لئے ہے کافر
ہائے مجھ سا عزیز ہو یوں خوار — حیف خورشید زیر خاکستر

قدردانی کا نام ہی نہ رہا ‌ ‌ ‌ چند ناداں ہوئے ہیں نام آور
اک امیر سخن شناس نہیں ‌ ‌ ‌ لاکھ ہیں شاعر ثنا گستر
کہیے گر بادشہ کو عرش سریر ‌ ‌ ‌ کہیے مہر بلاکو ہے چکر
صدا سعو کہے سے مانے بُرا ‌ ‌ ‌ حکما ء شنا جو ہے کافر
اب لب ہرزہ گونے ہرزہ درائے ‌ ‌ ‌ بس کہاں تک یہ ناستودہ سمر
کب تلک شکوۂ جفائے فلک ‌ ‌ ‌ تا کجا طعنۂ قمر چاکر
ہجو گوئی نہیں ہمارا کام ‌ ‌ ‌ ایسی باتوں سے خاموشی بہتر
پڑھ کوئی وہ غزل کہ عدا بھی ‌ ‌ ‌ حبذا حبذا کہیں سنکر
لاؤں اس مفلسی میں سوزن نید ‌ ‌ ‌ ہونٹ سینے دے گر نصیحت گر
جو مری سن لے میں بھی اُسکی سنون ‌ ‌ ‌ گر زباں گنگ ہے نہ گوش ہو گر
کیا کہوں جی پہ کیا گزرتی ہے ‌ ‌ ‌ یہ ستم کس کو آئے گا باور
نہ کوئی مایۂ دار حسن اتنا ‌ ‌ ‌ نہ کوئی مجھ سا عاشق بے زر
مانعین زکات ہیں اغیار ‌ ‌ ‌ یاد آیام نصفت سرور
مسند آرائے محفل تقدیس ‌ ‌ ‌ اولین جانشین پیغمبر

خاکساری پسند عرش مقام
آدمی صورت فرشتہ سیر

# قصیدہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

یہ قصیدہ شیخ یعقوب علی کی فرمائش سے ۱۸۶۹ء میں کہا گیا۔ ممدوح کا نام معلوم نہ ہو سکا مگر غالباً کسی امیر یا حاکم کی شان میں کہا گیا ہے۔ اس نمونے کو صرف اس لئے لکھا گیا ہے کہ متاخرین کے بعد قصائد کا رنگ اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو وہ اس انداز پر ہے :-

قید سخت اور خانۂ بے در — نکلوں کیوں کر جہان سے باہر
تنگ تر ہیں حدودِ خطۂ خاک — نہیں دنیا میں کوئی مشکل گزار
سعئ بیکار و فکر لاحاصل — نہ دوا میں نہ کچھ دعا میں اثر
ناشکیبا دل و پریشاں دل — پانوں کا ہوش ہے نہ سر کی خبر
ایسا حیراں کہ میں سمجھتا ہوں — آئینے کو بھی سدِّ اسکندر
کبھی مثلِ سحاب ہوں گریاں — گاہ مانند برق ہوں مضطر
کیوں نہ شکوہ کروں نصیبوں کا — کیوں نہ افسوس آئے قسمت پر
ہوں میں شمشیرِ لیک زنگ آلود — کوئی مل جائے قدرداں اگر
اس پہ کھل جائیں کچھ مرے اوصاف — اس پہ ظاہر ہوں کچھ مرے جوہر
آرزو سے زماں ہوں سر تا پا — حسرتِ روزگار ہوں یکسر
اپنے جوہر دکھائیے کس کو — نہ رہی آہ قدرِ تیغ و سپر

یہی الفاظ تھے زباں پر رات — کہ کہا مجھ سے عقل نے آکر
نہیں شایاں شکایت تقدیر — نامناسب ہے شکوۂ اختر
جتنے گزرے ہیں صاحبِ اوصاف — مورد طعن خلق تھے اکثر
وہی ہوگا جو ہو لیا پہلے — یعنی کیا چارۂ قضا و قدر
جس کو چاہے بنائے وہ گم نام — جس کو چاہے کرے وہ نام آور
رنج و محنت ہے گو زمانے میں — ہے تجھے تو مقام شکر مگر
بخت ناکام کا تجھے کیا خوف — گردش چرخ کا تجھے کیا ڈر
تو نہ دنیا کے غم میں ہو پابند — تو زمانے کا ہو نہ دست نگر
کہ ترا دستگیر ہے مہ جو دہ — اور ترا سر پرست ہے سرپر
وہ سخاوت منش سخاوت کیش — وہ کرم پیشہ وہ کرم گستر
وہ شریف و دست وہ شریف نواز — وہ ہنر دوست و ہنر پرور
وہ زمانے میں صاحب شمشیر — وہ رئیسوں میں قابلِ افسر
پیش کش ہے یہ مطلع ثانی — کہ قلم ہے رواں بطرز دگر
اے قمر چہرہ آفتاب افسر — اے فلک مرتبہ زمیں کشور
اے ترا فہم رونق تدبیر — اے تری رائے عقل کا زیور
ترے دم سے جہاں کا باغ امید — سبز و شاداب اور تازہ و تر
ترے فیض کرم سے ارزانی — فقرا کو بھی دولت قیصر

غیر واجب بیاں نہ تم کو پسند — ظاہر آرائی کا نہ میں خوگر
مدعا عرض فن شعر نہیں — شرح احوال واقعی ہے مگر
ہو گیا اتفاق سے مجبور — کیا میں نے خود اختیار سفر
ورنہ دوری کسے گوارا تھی — مجھ سے اور چھوٹ جائے تیرا در
کہ رہا بندہ وار مدت تک — الفت خاص سے ترے در پر
اب ترے التفات بے حد کی — یاد میں کر رہا ہوں عمر بسر
نہ مجھے حرص درہم و دینار — نہ مجھے آرزوئے لعل و گہر
چاہتا ہوں فقط یہی کہ رہے — گوشۂ چشم التفات ادھر

## قصیدہ مومن در نعت شریف

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس — کہ جیسے صبح شب ہجر نالہائے خروس
ہے اس طرح طرب انگیز کوکوئے قمری — کہ جیسے فوج مظفر میں شور غلغل کوس
دلائے طوطی شکر فشاں کی لذت سے — سماع رقص ہیں اہل مذاق جوں طاؤس
غبار صحن چمن کیمیائے عیش و نشاط — بہار لالہ و گل سیمیائے عرض شموس
صفائے در و دیوار باغ کا عالم — کہ آشیانوں میں دشوار طائروں کو جلوس
زہے فریب صفا خاک سبزہ ہے گلچیں — پڑے جو وسعت گلزار میں گلوں کے عکوس
ہجوم سبزہ سنے کی بسکہ رنگ آمیزی — زمیں یہ چادر مہتاب بن گئی ہے سندس
(سبز چادر)

ہوئی ہے سقفِ فلک مانعِ قدر افزائی
دگرنہ بید کہاں اور ترقیِ معکوس

ہو کیوں کہ ایسی رطوبت بہ سنگِ راہِ نسیم
بنا ہے شبنمِ گل آبگینۂ فانوس

خزانہ خاک میں ہر سنگ دل ملاتا ہے
زبسکہ لفظِ خزاں جانتے ہیں سب منحوس

نوید مالکِ گلزار کو ہو زر کی جگہ
ہر ایک کاسۂ گل میں ہے گنجِ دقیانوس

یہ آب و رنگ کہاں لعل اور زمرد کا
مگر دیا ہے گل سبزہ نے انہیں ملبوس

چمن کی خاک سے گلگونہ اب بناتی ہے
شگفتہ تا دمِ رخصت بھی ہو عذارِ عروس

حمیدہ شاخ سے یوں رنگِ گل چمکتا ہے
کہ جس طرح بھڑک اٹھے مشعلِ منکوس[1]

پڑھے مرغِ گلستاں وہ مطلعِ رنگیں
کہ سن کے بس جسے رہ جائے سن ہی بلبل وس

## مطلع

زبانِ لال کہاں اور مدحِ تاجِ خروش[2]
گرا ہے خاک پہ کیا لعل افسرِ کاؤس

ہزار داغ ہو پروائے آفتاب کسے
پرستشِ گلِ خورشید میں ہے گرم مجوس

شگفتہ تر ہے چمن روضہ ہائے جنت سے
ہنسی کی جا نہیں گر صومعہ نشیں ہو عبوس[3]

خلل پذیر رطوبت ہوا دماغِ بہار
عجب کہ سبزۂ خوابیدہ کو نہ ہو کابوس[4]

ہے دشت بزمِ طرب کثرتِ نتائج سے
نہ کیوں ہو شکل حماری کو بازِ شکلِ عروس

ہوا سے سیرِ چمن زار کی وہ مستی ہے
کہ خلق کو ہوئی مشکل حفاظتِ ناموس

عجب نہیں ہے کہ گلرنگ کی ہوس سے اگر
خود آ کے شیشۂ خالی میں ہو پری محبوس

---

[1] الٹا۔ اوندھا [2] سرخ پھول [3] ترش رو [4] نام مرض دماغی۔

مزاج دہر میں یہ اعتدال آیا ہے — کہ جس نبات کو دیکھو وہ صالح الکیموس[1]

عجب نہیں کہ بساں مگس عسل اُگلے — کہ ان دنوں ہو کوئی مبتلائے ابلاوس[2]

نمونہ کا معجزہ صل علیہ پھر گندم — ہوا ہے جنبش غربال سے بنے ہے سبوس[3]

رطوبت ایسی نظر آئی داغ لالہ میں — کہ چاک چاک حسد سے ہوا دل افیوس[4]

قبائے گل کو گر اطلس سے دیجئے تشبیہ — سیاہ پوش جبل ہو دروں ماتم سوس[5]

قوائے نامیہ کو ناگوار ہے رکتنا — کہ ہضم رابعہ محتاج ہو سوئے کیلوس[6]

ہوا ہے اب تو یہ سرمایۂ لطافت آب — کہ پشت ماہی پہ گلہائے اشرفی ہیں فلوس[7]

کہیں جہاں میں کائی نظر نہیں آتی — کہ صرف رنگرزاں ہو گئی بجائے ایوس[8]

سیاست نم آب وضو سے دور نہیں — جو سبزہ زار بنے ریش زاہد سالوس[9]

بعید کچھ نہیں شادابی زمیں سے اگر — زیادہ تر کرے میلان خون گل شاموس[10]

گر اس بہار کی یعقوب کو ہوا لگ جائے — شمیم جامۂ یوسف کبھی نہ ہو محسوس

ہوا سے بسکہ گل شمع بھی ہے عطر آگیں — مدیل طبلۂ عطار بن گئی فانوس

یہ گل کھلاتی ہیں آب و ہوا کی ترتیبیں — کہ ہے پیاز کو لاف منافع ملبوس[11]

ہوائے جنبش اوراق سے ہیں عطر فروش — لغات درد کہ ہیں ثبت صفحۂ قاموس

فسوں گری دم مشاطۂ نسیم کی دیکھ — کہ مشک نافہ ہوئی غنچہ ہائے زلف عروس

---

[1] ہضم کا دوسرا درجہ [2] نام مرض [3] بھوسی [4] مرطوب سیاہ پھل [5] ریشم کا کیڑا [6] ہضم کا پہلا درجہ [7] مچھلی کے سنے [8] زنگار [9] مکار [10] سنگ جراحت [11] ایک جڑی کا نام جو پہاڑ سے مشابہ ہے۔

صفات آئے جو آئینہ ہوا میں نظر　　اگا ہی خود ہے عوارض کو اعتبار نفوس
سدا نکلتی ہے مل کر ہوا سے کیا ہو فرق　　کہ بانگ خندۂ گل ہے کہ نالۂ ناقوس
عجب ہوا ہے کہ فیض ہوا سے ہوتا ہے　　شکم میں خستہ کے نشو و نمائے اصل السوس[1]
غریق آب خجالت ہوا کے فیض سے ہوں　　کہ گل ہوا ہے مرا غنچۂ دل مایوس
ہوا ہے کون سی ایسی مگر مدینہ کی　　دم مسیح کو ہے جس کی حسرت پا بوس
شرف مدینہ کو جس سے ہے ہو بہو وہ ہو　　جسے بتاتے ہیں محبوب حضرت قدوس
جو خواب میں بھی کبھی دیکھتی جمال اُس کا　　تو دیتی دل دہی یوسف کو دختر طیموس[2]
جو شمع بزم کہوں اُس کے روئے تاباں کو　　کہاں وہ ماہ بنے نور شعلۂ فانوس
وہ کون احمدؐ مرسل شفیع ہر دوسرا　　جو خلق کا سبب اور باعث معاد نفوس
جہاں مطاع شہنشاہ آفتاب نشاں　　فلک سریر قمر طلعت و فلک ناموس
یہ اُس کے حفظ سے ہے ملک معدلت محروس　　سیاہ چشموں کو شش نگاہ دزدیدہ
نگاہ بانیٔ عصمت سے وہ رواج حیا　　کہ چار چشم نہ ہوں نرگس و دادا نیوس[3]
سُنے ہے دورہ عدالت میں اُس کے شیر نڈر　　سنان کی ضرب بیجا سے نالش جاموس
کرم میں و دل اُسے نیساں سے کس طرح تشبیہ　　کروں میں جان کے کیوں کر ترقی معکوس
کہ جن کی بخشش یک روزہ کو وفا نہ کریں　　ہزار سالہ گہر ہائے قلزم و قابوس
یہ جی میں ہے کہ پڑھوں اور ایک مطلع　　جو ہو ہر ایک متنفس کی طبع سے مانوس

---

[1] دوا کا نام [2] زلیخا [3] ایک قسم کا پھول۔

## مطلع ثالث

ترے ہے فیض سے ہر قطرہ آبیا مجوس
ترے ہے نور سے ہر ذرہ جلوہ زار شموس

ہمیشہ عفو ترا طالب گنہ گاراں
مدام رحم ترا درد مند کا جاسوس

ترے حسود کی نسبت جلا ہی ہو نہ کیوں
ہجوم شعلہ سے دوزخ ملے کفِ افسوس

تری غلامی کی دولت سے خاک پائے بلال
سفیدۂ رخ فغفور چیں و خسرو روس

خدا کے واسطے گرم دعا ہو بس مومن
کہ منتظر ہے ازل سے اجابت قدوس

ہے جب تلک گل و بر قسمت نہال و شجر
ہے جب تلک دل لالہ میں داغ حسرت بوس

مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخل مراد
رہین داغ عدد کا رہے دل مایوس

## قصیدہ غالب در منقبت حضرت مولیٰ علیؓ

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بیدلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسیہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسین

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد اک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثل مضموں وفا باد بدست تسلیم
صورت نقش قدم خاک بفرق تمکیں

---

لہ شدت غم ۱۲-

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اُس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خالق کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

جنبشِ تیغ کا ہے اس کی جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے اسباب ثنا آمادہ — خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں — تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا — کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں
جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد — کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب — ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسن قبول — کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز — کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمی شوق — کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا — نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں
صرف اعدا اثر شعلۂ دود دوزخ — وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں

## قصیدہ غالب در مدح ابوظفر بہادر شاہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردش ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرور خاص خواص — حبذا اے نشاط عام عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امیدگاہ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرز استفہام
مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روزہ بر سبیل دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بتقریب عید ماہ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوے بخشش خاص — گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرّ و فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مے گلفام
جب کہ چودہ منازل فلکی — کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتوے ہوں فروغ پذیر — کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اک بلوریں جام

کہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن — نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف — نو بہار حدیقۂ اسلام
اے ترا لطف زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ عارفانہ کلام
وارث ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام

# قصیدہ حالیؔ

## در تہنیت جشن سالگرہ چہل سالہ حضور نظام دکن آصف جاہ سادس واقع ۱۳۲۳ھ

زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے شادمانی کا — فلک پیری میں دم بھرتا ہے اُن روزوں جوانی کا
نظر آتی ہے بے جام و سبو سب خلق متوالی — ہوا میں نشہ ہے گویا شراب ارغوانی کا
نشاط انگیز ہیں ایام ایسے خور داد سے بڑھ کر — نہیں چلتا جہاں میں زور کچھ باد خزانی کا
مٹا لے یاں رنج و غم کا بھول کر نام ان دنوں کوئی — کہ قبضہ ہے دکن پر آج عیش و کامرانی کا

بہارِ جشنِ آصف جاہ سے گلزار ہے عالم
کرے کون انتظار اب فصلِ گل کی گلفشانی کا

خراماں ہیں ہزاروں سرو قامت شہرِ محرا میں
جچے گا رنگ کیوں کر آج سروِ بوستانی کا

معطر ہے جہانِ مشک و عنبر بزمِ شاہی سے
بھرے باد بہاری دم نہ اب عنبر فشانی کا

الا میں سطر نوکی جب نہیں چپ لگ گئی سب کو
بہت دعویٰ تھا مرغانِ چمن کو خوش بیانی کا

نئی دنیا ہے یہ یا کینچلی بدلی ہے دنیا نے
کوئی یاں آن کر دیکھے سنگھار اس نرالی ملکانی کا

یہ ہے اُس تاجور کی جوبلی کا جشن چہل سالہ
کہ جو ہے ملک میں ملجا اقاصی و ادانی کا

دعائے طولِ عمرِ شہ یہ ہاتھ اٹھیں نہ کیوں لاکھوں
کہ ذات اس کی نمونہ ہے خدا کی مہربانی کا

رعیت شاد ملک آباد اور آزاد ہر ملت
ادا حق کر دیا شاہِ دکن نے حکمرانی کا

وہ رہتے ہیں سدا زندہ جو محبوبِ خلائق ہیں
نظام الملک کو مژدہ حیاتِ جاودانی کا

کھلا اُس کی رعیت پروری و ملکداری سے
جہاں بانی حقیقت میں ہے نام اک گلہ بانی کا

گدا صبر و شکیبائی پہ اپنی پھر نہ ہو نازاں
کرے اندازہ گر شاہ ہو کے افکارِ نہانی کا

اُسے ہے فکر بس اپنے لئے نانِ شبینہ کی
مگر یاں سوچ اک عالم کی ہے راحت رسانی کا

کسان آگاہ ہو گر حکمرانی کے فرائض سے
نہ بدلے حکمرانی سے تردد قلبہ رانی کا

ہر اک ملت ہر اک مذہب سے ہے یکساں سلوک اس کا
کوئی گر سیکھ لے اس سے جہاں کی پاسبانی کا

تعصب، اجنبیت، اختلافِ مذہب و ملت
نہیں کوئی مزاحم اُس کے دریا کی روانی کا

جہاں ہے مستحق کوئی وہ ہے روزینہ خوار اُس کا
دکن سے ہند تک چرچا ہے اُس کی حق رسانی کا

توکل اور قناعت کے بھی اب ہونے لگے شاید
بہت پھیلا ہوا ہے خوان اُس کی میزبانی کا

رہے گا ملک میں باقی نہ ہرگز بے ہنر کوئی — یہی انداز ہے گر یاں ہنر کی قدردانی کا
بنا ہے بلدہ خود دارالشفا اس عہد فرخ میں — یہ اک شمہ ہے آصف جاہ کی راحت رسانی کا
نہیں آصف کو جان اور مال ہرگز دریغ اس میں — خلاصہ ہو یہ خود حضرت کے ارشاد زبانی کا
ہوئے ہیں جس قدر ابواب خیر اس عہد میں جاری — کریں اُن کو بیاں کیا منہ ہے الفاظ و معانی کا
وہ کالج جس نے مردہ قوم میں پھر جان ڈالی ہے — اسی منبع سے جاری ہو وہ چشمہ زندگانی کا
دگرنہ قوم میں تعلیم کا ایسا ہی تھا توڑا — کہ ہو گرمی کی شدت میں توڑا جیسے پانی کا
علی گڑھ میں رہے گا بن کے دارالعلم یہ کالج — یہی عالم ہے گر بذل و عطائے خسروانی کا
دعا پر مدحت شہ ختم کرتا ہے بس اب حالی — نہیں ممکن کہ ہو اُس سے ادا حق مدح خوانی کا
خدا کی مہربانی کا رہے طالب جہاں جب تک — ہو سایہ شاہ و شہزادہ پہ اس کی مہربانی کا
رہے آباد یہ گھر یا الٰہی رہتی دنیا تک — کہ مرجع ہے یہ اک عالم کے آمال و امانی کا
نظام الملک آصف جاہ سادس آصفِ ثانی — رہے مالک سدا دیہیم و تخت خسروانی کا

## قصیدہ قدر بطور مخمس

آئی بہار سبز ہوا چرخ اخضری — ہے کہکشاں بھی صورت شاخ چمن ہری
کیا لالہ زار ہے شفق چرخ چنبری — سورج مکھی ہوا گل خورشید خاوری
اب کی بہار آئی ہے کیسی ہری بھری
ہر سمت دھوم دھام ہے فصل بہار ہے — رندوں کا اژدحام ہے فصل بہار ہے

ساقی کا اہتمام ہے فصلِ بہار ہے — خم ہے سبو ہے جام ہے فصلِ بہار ہے
کرتا ہے ابر تاک عجیب فیض گستری

طاؤس پھر رہے ہیں خراماں چمن چمن — ہیں یاسمین و سنبل و ریحاں چمن چمن
کیسا کھلا ہوا ہے گلستاں چمن چمن — اب تو ہوا ہے تختِ سلیماں چمن چمن
بوٹے اُگے ہیں باغ میں امسال کیاری

گل ڈال ڈال ہے تو صبا پات پات ہے — یہ باغ بھر کی روح ہے کیا اسکی بات ہے
سبزہ اُگا ہے وہ کہ خضر جس سے مات ہے — گلزار میں ہے حوض کہ آبِ حیات ہے
دیوان بوستاں ہے کہ سدِّ سکندری

ہے آبرو بہار کی اب تو خدا کے ہاتھ — پھیرے ہیں باغباں نے کس کس طرح کے ہاتھ
وہ رہ گیا چنار بھی اپنے بڑھا کے ہاتھ — پھیلے ہوئے ہیں باغ میں موجِ صبا کے ہاتھ
پیڑوں کے تھالے ہوگئے پھولوں کی ٹوکری

طارم کھچا تو عرشِ معلّٰے سے بڑھ گیا — شمشاد اٹھا تو سدرہ طوبےٰ سے بڑھ گیا
سبزہ چلا تو خضر و مسیحا سے بڑھ گیا — سنبل بڑھا تو زلفِ چلیپا سے بڑھ گیا
اک اک صحن باغ میں ہے کس قدر ہری

اللہ کیا ہوا ہے گلستاں ہے دل پسند — ایسی خنک کہ ہوتی ہے نرگس کی آنکھ بند
کشمیر ہر زمین چمن کو ہے رشک خند — موجِ صبا سے ابر بھی رہتا ہے بہرہ مند
اللہ اکبر ایسی ہے گلزار میں تری

دیکھو تو منتظر ہیں گل و نرگس ہیں کس قدر — آہٹ پہ کان ہیں تو در باغ پر نظر
مجرے کو جھک رہے ہیں درختان بارور — لاتا ہے ایلچیٔ صبا ہر گھڑی خبر
آتا ہے نونہال گلستان برتری

کیا مرتبہ قدوم سعادت لزوم ہے — ہر چار سمت مجمع اہل علوم ہے
دھومیں ہٹو بچو کی ہیں اُس پر ہجوم ہے — مہراج مان سنگھ بہادر کی دھوم ہے
اللہ رے عادل و سخی و عاقل و جری

گو لاکھ فکر لاکھ رہے غور قدر کو — ایسا نظر نہ آئے گا اب اور قدر کو
کر دے گا کامیاب وہ فی الفور قدر کو — عادت ہے بندگی کی اسی طور قدر کو
جس طرح اُس کی ذات میں ہے بندہ پروری

—— ✻ ——

سید عبد الرب جعفری نے (ضیا، پریس میں چھپوا کر) ادارہ
"شرکت مصنفین" تالپور بلڈنگ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے شائع کیا

(کتبہ حافظ حبیب اللہ علیگرین)

# ہمارے افسانے

## از پروفیسر وقار عظیم

افسانہ ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا آئینہ ہے۔ زندگی کے نباض اور رمز شناس افسانہ نگاروں کا مطالعہ اور مشاہدہ اس آئینہ میں ہمیں زندگی کا بے نقاب عکس دکھاتا ہے اور اس طرح ہم اپنی زندگی کی دھڑکنیں خود اپنے کانوں سے سُن سکتے ہیں۔

لیکن اس افسانہ میں کیا ہے اور ان افسانہ نگاروں نے اس آئینہ کو کیسے کیسے جِلا دی ہے اس کا صحیح عکس آپ کو اُردو کے مشہور نقاد پروفیسر وقار عظیم کی کتاب "ہمارے افسانے" میں نظر آئے گا۔

"ہمارے افسانے" اُردو افسانوں کی گوناگوں روشوں کا سیر حاصل تبصرہ اور ۲۷ افسانہ نگاروں کے طرزِ نگارش کی تنقید ہے۔

مجلد دیدہ زیب گردپوش۔ قیمت:۔ دو روپے آٹھ آنے

## اُردو اکیڈمی سندھ

مشن روڈ کراچی ۱